اُردو ادب
کے
خوابیدہ ستارے
(25 نامور ادیبوں کے بارے میں ایک معلوماتی دستاویز)
ڈاکٹر انور سدید

امن انقلاب بذریعہ کتاب
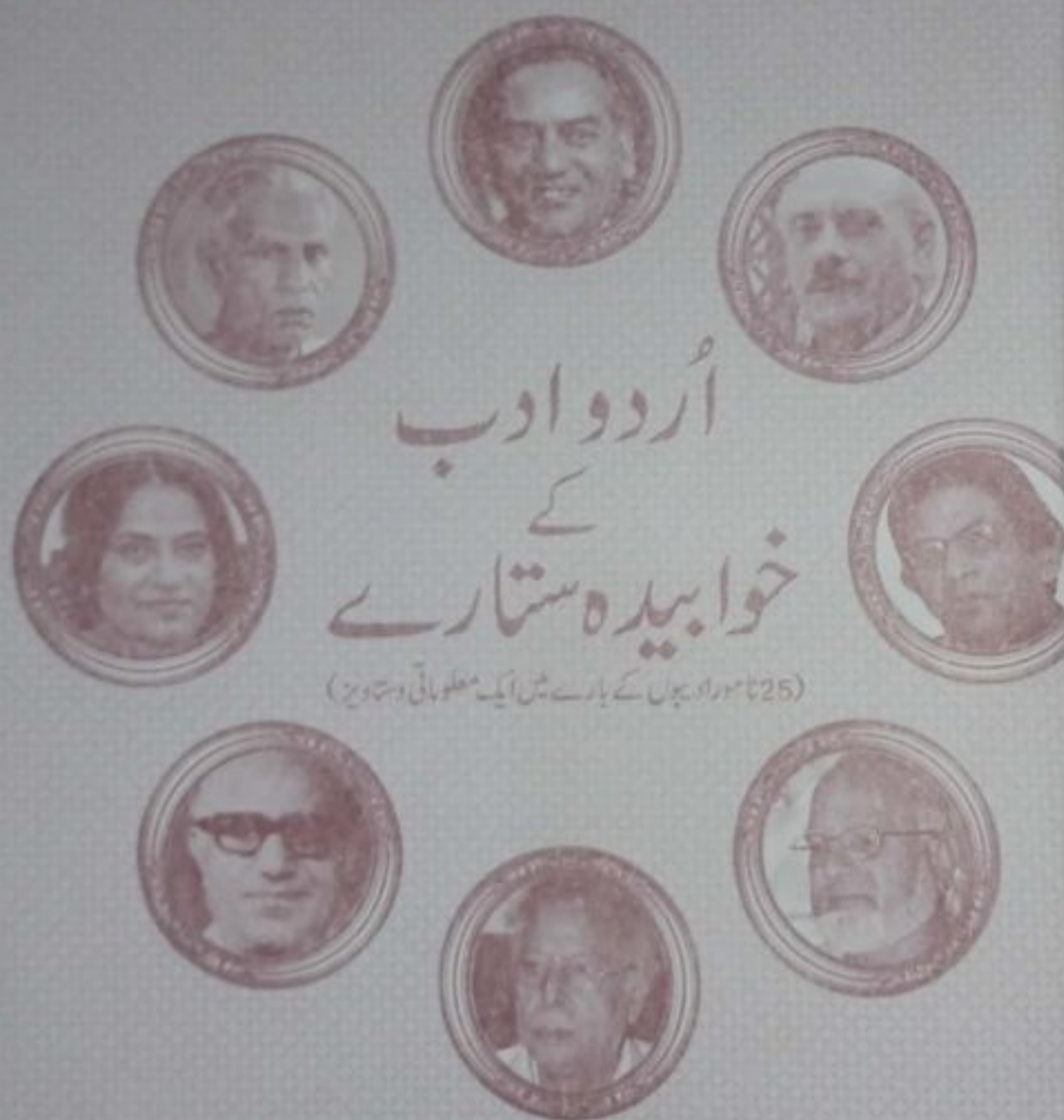
Peace revolution
through Book Evolution

اُردو ادب کے
خوابیدہ ستارے

(25 نامور ادیبوں کے بارے میں ایک معلوماتی دستاویز)

ڈاکٹر انور سدید

نیشنل بک فاؤنڈیشن
اسلام آباد

نگران : پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید
مصنف : ڈاکٹر انور سدید

فنی تدوین : خورشید ربانی
اشاعت اول : اپریل 2016ء
تعداد : 2000
کوڈ نمبر : GNU-563
آئی ایس بی این : 978-969-37-0932-2
طابع : محمود برادرز پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی
قیمت : 130 روپے

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی مطبوعات کے بارے میں مزید معلومات کے لیے رابطہ:
ویب سائٹ: http://www.nbf.org.pk، فون: 92-51-9261125
ای میل: books@nbf.org.pk

پروفیسر صابر لودھی

اور

افسانہ نگار فرخندہ لودھی

کے نام

''اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں''

ترتیب

پیش لفظ

ڈاکٹر انور سدید نے تنقید کے علاوہ افسانہ، شاعری، انشائیہ نگاری، ادارت، تبصرہ نگاری، خاکہ نگاری، شخصیت نگاری اور صحافت کے شعبے میں بھی قابل قدر کام کیا ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے وہ سارے مضامین یکجا کر کے پیش کیے ہیں جو انھوں نے فیض احمد فیض، ڈاکٹر رشید حسن خان، شفیع عقیل، انجم رومانی، اے حمید، حفیظ تائب، مظفر وارثی، عبدالعزیز خالد، احمد عقیل روبی، صابر لودھی اور ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان سمیت دیگر ادیبوں کی وفات پر تحریر کیے تھے۔

ان مضامین کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان میں ڈاکٹر انور سدید نے ہر شخصیت کی زندگی کے احوال و واقعات اور ادبی خدمات کو یوں جامع انداز سے پیش کیا ہے کہ کوئی اہم پہلو تشنۂ بیان نہیں رہا۔

نیشنل بُک فاؤنڈیشن کی طرف سے علم و دانش اور اس سے وابستہ اہم شخصیات سے متعلق کتب کی اشاعت کے لیے ترجیحی بنیادوں پر کام ہو رہا ہے اور یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ اُردو ادب کے طلبہ و اساتذہ اور عام قارئین اس کتاب سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق جاوید

مینیجنگ ڈائریکٹر

عرضِ سدید

''اردو ادب کے خوابیدہ ستارے'' چند ایسے مصنفین اور دانشوروں کے فن اور شخصیت کا تذکرہ ہے جو اب اس دنیا میں موجود نہیں لیکن جن کے علم و دانش اور تخلیق و تنقید سے زمانے نے روشنی حاصل کی۔ ادب کے یہ لوگ معاشرے کے مشعل بردار تھے۔ وہ قلم کی روشنائی سے دہر کے اندھیروں کو دور کرتے تھے اور ذہن کے واہموں کو رفع کرتے تھے۔ ان کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد یوں محسوس ہوتا کہ دانش و فرد کی کائنات میں خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ جو کبھی پُر نہیں ہوگا۔ میں نے اپنی کتاب ''ادیبانِ رفتہ'' میں یہ حقیقت بیان کی تھی کہ

> ''جب کوئی ادیب اس جہان فانی سے رخصت ہو جاتا ہے تو میں شدید کرب میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ ادب کے افق سے جو ستارہ ٹوٹ کر عدم کی وسعتوں میں کھو گیا ہے، اس کی جگہ ہمیشہ خالی رہے گی۔ بلاشبہ زندگی کا سفر جاری ہے اور نئی نسل سے نئے ستارے طلوع ہو رہے ہیں اور رونق کہکشاں بھی قائم ہے لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک ٹوٹے ہوئے ستارے کا خلاء کبھی پورا نہیں ہوا۔''

تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اہل فرد اپنے جسمانی وجود کے ساتھ اس جہان سے تو رخصت ہو جاتے ہیں لیکن بقول علامہ اقبال:

''جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں''

اور یہ نابغہء روزگار انسان آنکھ سے غائب ہو جانے کے باوجود فنا نہیں ہوتا۔ میں نے

ایسے ادیبوں کو ہمیشہ ان لوگوں میں شمار کیا جو زیر لحد خوابیدہ ہیں اور اپنے ادب پاروں کے وسیلے سے ہمارے ساتھ ہم کلام ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں بھی میں نے چند خوابیدہ ادیبوں سے خلوت میں ملاقات کرنے اور ان کی شخصیت اور فن کے نقوش اپنے الفاظ میں اتارنے کی کاوش کی ہے۔ خلوت کی ملاقاتوں اور باتوں میں اب میں آپ کو شامل کرنے کا آرزومند ہو۔

یہ شخصیت اور فن نامے مختلف رسائل کے اوراق میں بکھرے پڑے تھے۔ زندگی کے اس دور میں جب عمر کی نقدی ختم ہو رہی ہے، میں نے انہیں دست برد زمانہ سے بچانے کے لیے کتاب کی صورت دی ہے۔ اور یہ ''قلم کے لوگ''، ''مکرم چہرے''، ''زندہ لوگ''، ''ادیبان رفتہ''، ''سعید صورتیں'' اور ''نقوش رفتگان'' کے سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

میں اسے اپنا اعزاز سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب نیشنل بک فاؤنڈیشن سے شائع ہو رہی ہے جس کے نئے صدر نشین پنجابی اور اُردو کے ممتاز شاعر، محقق، نقاد اور مزاح نگار ڈاکٹر انعام الحق جاوید ہیں۔ تھوڑے سے عرصے میں ہر عمر کے قاری کے ذوق کی معیاری کتابیں خوبصورت انداز میں پیش کر کے ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اس فنی میدان کے بھی شاہ سوار ہیں۔ اور ان کی قیادت میں نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد ارتقاء کا اگلا قدم اٹھا رہا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر احمد عقیل روبی

احمد عقیل روبی میرے دوستوں میں سے نہیں تھے ۔ ملاقاتوں کی کثرت بھی نظر نہیں آتی ۔ یوں سمجھئے کہ کسی ادبی تقریب میں اتفاق سے مل جاتے تو ہم ایک دوسرے کو پہچان لیتے اور مصافحہ بھی کرتے لیکن آج جب ناصر بشیر کے موبائل سے ان کی رحلت کی خبر ملی تو دل صدمے سے ڈوبنے لگا اور کیفیت ایسی ہی تھی جیسی رحمٰن مذنب ، فرخندہ لودھی، غلام الثقلین نقوی، ڈاکٹر وحید قریشی، شہزاد احمد، سجاد نقوی اور ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات پر دل و جان نے محسوس کی تھی۔ اندر سے آواز آئی ۔ایک چراغ اور بجھ گیا ہے ۔۔ تاریکی اور بڑھ گئی ہے۔ احمد عقیل روبی علم اور فلم میں بٹے ہوئے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ فلمی دنیا سے ان کا تعلق مجبوری کا تھا کہ تمول کے بغیر زندگی گزارنے کے لیے بھی پیسہ ایک اہم قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ان کا حقیقی عشق ادب سے تھا جس کی نمائش ان کے مزاج کے خلاف تھی ۔ بنیادی ذوق شاعری سے تھا۔ جنرل ایوب خان کے مارشل لاء کے خلاف تحریک چلی تو احمد عقیل روبی بھی جلسے جلوسوں میں شریک ہوتے اور خوب نعرہ بازی کرتے ۔ اپنی مترنم تک بندی سے عوام کے دلوں کو گرماتے اور گرفتاریاں شروع ہوئیں تو احمد عقیل روبی بھی دھر لیے گئے ۔ انہوں نے جو نظم پڑھی تھی ،اس کا ایک شعر یہ تھا:

آ ہوش میں ذرا تو گولی چلانے والے
پیچھے نہیں ہٹیں گے جانیں لڑانے والے

اس وقت احمد عقیل روبی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے تھے اور خیالات باغیانہ رخ اختیار کر رہے تھے ۔ ایک رات جیل میں کاٹی ،دوسرے روز فوجیوں نے جنگل میں شہر سے چند کوس دور لے جا کر چھوڑ دیا۔ پریشان ماں سے گھر آ کر وعدہ کیا کہ آئندہ جلسے جلوسوں میں شریک نہیں ہوں گے ۔لیکن شاعری ترک نہ کی۔ حتیٰ کہ اپنی روح کے تقاضوں کے تحت ہمارے

پورے وجود کے ساتھ ادب کی طرف آ گئے تو اس دور کی گروہ بندی سے بھی باعزت فاصلہ قائم رکھا۔ دراصل کتاب کی محبت نے انہیں دنیاداری کے جھمیلوں میں الجھنے اور ادبی سیاست کے خارزار سے دامن تارتار کرنے کی فرصت ہی نہ دی۔ اہم بات یہ کہ ان کا مطالعہ ان کی کتابوں سے اپنی وسعت آشکار کرتا لیکن جب ان کی تعریف کی جاتی تو انتہائی انکسار سے کام لیتے اور کہتے:

''مطالعے میں تاک نہیں۔ پڑھنے کی کوشش کرر ہا ہوں۔ ہر طاقت ور ادیب کا مطالعہ کرتا ہوں، جتنا سمجھ آ جائے، اس پر اکتفا کرتا ہوں۔ نئی انسانی جہتوں کو جاننا، انسانی نفسیات کے تاریک گوشوں میں جھانکنا میری کمزوری ہے۔ یہ کام بڑے ادیبوں نے کیا ہے۔ ان کے تجربات سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ کتاب میری کمزوری ہے۔ چاہے خریدوں۔۔۔ چوری کروں۔۔۔ یا ادھار لے کر پڑھوں۔ پڑھتا ضرور ہوں۔ بڑے ادیب، شاعر، فنکار میرے آئیڈیل ہیں جو صدیوں سے وقت کی راہ پر باوقار انداز میں چلے آ رہے ہیں۔ انکا عہد انہیں ختم نہیں کر سکا۔ زمانہ حال انہیں اپنا سمجھتا ہے۔ مستقبل باہیں پھیلا کر ان کا انتظار کر رہا ہے۔ میں اور میری تنہائی دونوں مل کر ہومر، ورجل اسائی لس، سونوکلیز، یوری پیڈیز، دانتے، ہوریس ملٹن، شکسپیئر، شیلے، بائرن، فردوسی، گوئٹے، مولانا روم، شیخ سعدی، روسو، والیٹر، ولی، میر، غالب، فراق، فیض احمد فیض اور ناصر کاظمی سے باتیں کرتے ہیں۔ یہی میرے آئیڈیل اور راہنما ہیں۔''

چنانچہ ارسطو، دانتے، شیکسپیئر، جارج برنارڈ شا، دوستوفسکی، سارترے، غالب، میر تقی میر، فیض احمد فیض، احسان دانش، ڈاکٹر وزیر آغا، ناصر کاظمی اور سجاد باقر رضوی سب سے عقیل روبی نے فیض حاصل کیا لیکن اپنا گرو انتظار حسین کو تسلیم کیا جو ان کی نظر میں رومن ایمپائر کے عروج کے زمانے کے ادیب تھے۔ اور اکرام اللہ، زاہد ڈار اور ایرج مبارک ان کی قلمی مشقت کی حوصلہ افزائی کرتے تو اسے دل و جان سے قبول کرتے کیونکہ یہ پاک ٹی ہاؤس میں ''انتظار حسین کارنر'' میں باقاعدگی سے بیٹھنے والے ادیب تھے۔ ان کے ادبی سفر میں کٹھنائیاں یا پیچیدگیاں آ جاتیں تو اپنے قلبی اور روحانی گرو کی طرف رجوع کرتے اور انتظار حسین ان کی مشکل آسان کر دیتے۔

احمد عقیل روبی لدھیانہ کے قریب واقع ایک قصبہ نما شہر سنگرور میں 16 اکتوبر 1940ء کو پیدا ہوئے تو ان کے والدین تین کم سن بچوں کی موت کے صدمے صبر و شکر سے برداشت کر چکے تھے۔ اور چوتھے بچے کے لیے اللہ کے حضور میں سجدے گزار رہے تھے۔ پیروں فقیروں کی درگاہوں پر حاضر ہو کر ''عرض مطلب'' پیش کرنے لگے۔ اجمیر شریف تک ننگے پاؤں ہو آئے۔ آخر ان کی دعا مستجاب ہوئی۔ اور احمد عقیل روبی پیدا ہوئے۔ نام غلام حسین رکھا جس کے ساتھ سوز کا اضافہ انہوں نے اپنی ابتدائی تک بندی کے شعوری دور میں کیا۔ المیہ یہ ہوا کہ سات سال کی عمر میں تھے کہ ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور انہیں یتیمی کا داغ قبول کرنا پڑا۔ یہ پاکستان بننے سے سات دن پہلے کا واقعہ ہے۔ عقیل روبی نے والد کی وفات کے دن کو یاد کیا تو لکھا:

> ''اس دن میں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ اور وہ منظر یہ تھا کہ جب میرے والد کا جنازہ اٹھا تو میری والدہ کے چہرے پر ایک عجیب و غریب تبدیلی آئی۔ اس دن مجھے محسوس ہوا جیسے میری ماں نے اپنے وجود کے اندر سانس لیتی ہوئی عورت کا گلا گھونٹ دیا ہے اور اس کی جگہ ایک مختی اور باہمت مرد کو جگہ دے دی ہے۔''

عقیل روبی خود راوی ہیں:

> ''میری ماں نے مرد بن کر میری پرورش کی، ہر مصیبت کا سامنا مردوں کی طرح سینہ تان کر کیا۔ نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ نہ کسی سے مدد طلب کی...... ساتھ ساتھ مجھے سکھاتی رہی کہ میدان جنگ میں لڑنے کا سامان کم ہو تو جنگ کیسے جیتی جاتی ہے۔ گیارہ بھائیوں کی لاڈلی بہن تھی۔ کبھی کسی نے پھول تک نہیں مارا تھا۔ راہ حیات میں مجھے لے کر تنہا چلی تو ضرورتوں اور مایوسیوں کے سارے پتھر حوصلے کی ڈھال پر روکے۔ 1947ء میں جب قافلہ پاکستان کے لیے روانہ ہوا تو میرا ہاتھ

پکڑ کر یہ سب سے آگے تھیں۔ پاکستان کی سرحد پر قدم دھرتے ہی سجدہ
کیا اور سینہ تان کر نئی دنیا میں داخل ہو گئی۔"

پاکستان کے متوالوں کا یہ قافلہ لدھیانہ سے چلا تو واہگہ کے راستے لاہور میں داخل ہوا۔ لیکن وانسن کیمپ میں رکا نہیں بلکہ آگے بڑھتا گیا اور خانیوال جا کر ڈیرا ڈالا۔ احمد عقیل روبی نے پرائمری سے ایف۔اے تک تعلیم اسی شہر میں حاصل کی۔ سکول کے زمانے کا یہ واقعہ اہم ہے کہ جب یتیم طلباء سے فیس کی معافی کی درخواستیں طلب کی گئیں تو عقیل روبی نے بھی (جو اس وقت غلام حسین سوز تھا۔ اپنی عرضی لکھنی شروع کی۔ ماں نے پوچھا تو بتلا دیا کہ فیس معافی کی درخواست ہے۔" ماں نے عرضی لے کر پھاڑ دی اور با اعتماد انداز میں کہا:

"میں نے تیرے باپ کے جنازے پر قسم کھائی تھی کہ تجھے باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔ تیرا باپ مرا نہیں۔ زندہ ہے۔ میری طرف دیکھ"

اور اس کے بعد احمد عقیل روبی نے پوری فیس ادا کر کے تعلیم حاصل کی اور بی۔اے گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان سے کیا جہاں اردو کے ممتاز نقاد اور جدید شاعر عرش صدیقی ان کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوئے اور انہوں نے عقیل روبی کے ذوق کو سنوارنے میں فعال کردار ادا کیا۔ کتابوں کے مطالعے میں دلچسپی پیدا کی اور تعلیم کے سلسلے کو مزید آگے بڑھانے کا مشورہ دیا۔ اس دور میں عقیل روبی کالج کے مشاعروں میں شامل ہونے لگے تھے۔ چنانچہ انہوں نے غلام حسین سوز کو سرکاری کاغذوں کی نذر کر دیا اور اپنے ادبی تشخص کے لیے نیا نام احمد عقیل روبی اختیار کر لیا جو غلام حسین سوز کا ہمزاد تھا لیکن بعد کے دورِ حیات میں ہمیشہ پس پردہ ہی رہا۔ ایم اے کرنے کے لیے لاہور آئے تو اورینٹل کالج لاہور کے آفاق پر خورشید رضوی، ریاض مجید، اسلم انصاری، انور مسعود اور عابد صدیق جیسے ستارے چمک رہے تھے۔ عقیل روبی کو اس کہکشاں سے باہر ایک اور قلبی ستارے نے زیادہ متاثر کیا۔ اس کا نام ناصر کاظمی تھا۔ جو میر تقی میر کے کلاسیکی تاثر سے اپنی

غزل کی انفرادیت نکھارنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ناصر کاظمی کو آزادی کے بعد غزل کا مزاج منقلب کرنے اور اس صنف سخن کی نشاۃ ثانیہ برپا کرنے والا شاعر تسلیم کیا ہے عقیل روبی نے پاک ٹی ہاؤس میں ان کا دامن پکڑا تو ان کی غزل کی روح کو اپنے باطن میں اتار لیا۔ اور اسی کے خمیر سے اپنی غزل کا مزاج سنوارا اور ٹمپل کالج لاہور میں عقیل روبی احترام سب اساتذہ کا کرتے تھے لیکن اپنا راہنما پروفیسر سجاد باقر رضوی کو بنایا جن کی شخصیت کے قرینے دوسرے اساتذہ سے الگ تھے۔ اور ان کے بارے میں یہ بات برملا کہی:

> ''سجاد باقر رضوی میرے روحانی باپ تھے۔ اور بیٹا باپ کا سر سے لے کر پاؤں تک احسان مند ہوتا ہے۔ میں باقر صاحب کی اک اک ادا، اک اک رنگ سے متاثر ہوں۔ باقر صاحب مجھے نہ ملتے تو میں شاید کبھی کا کہیں کھو گیا ہوتا۔ باقر صاحب نے تو ایک گونگے کو زبان، اندھے کو بینائی اور ایک گمنام شخص کو شناخت بخشی ہے۔''

ناصر کاظمی اور سجاد باقر رضوی پر احمد عقیل روبی نے ان کی وفات کے بعد اپنے آنسوؤں کو سمیٹا تو یہ ان کے فن اور شخصیت پر دو کتابیں بن گئیں جواب ان دو عظیم المرتبت ادبی شخصیات پر بنیادی حوالے کی کتابیں شمار ہوتی ہیں۔ امجد اسلام امجد نے عقیل روبی کی وفات پر اپنے کالم میں یہ بات خصوص سے لکھی:

> ''عقیل روبی ایک احسان شناس آدمی تھا۔ سو اس نے تقریباً ہر اس شخص کا خوبصورت شخصی خاکہ لکھا جس نے اس کی فکری اور ذاتی تربیت میں کسی بھی حوالے سے حصہ لیا تھا۔ ہمارے مشترکہ استاد سجاد باقر رضوی مرحوم، اور منفرد شاعر ناصر کاظمی پر لکھے ہوئے اس کے خاکے پھیل کر کتابی شکل اختیار کر گئے اور اب ان کا شمار اردو کے بہترین شخصی خاکوں میں ہوتا ہے۔''

ایم اے (اردو) کرنے کے بعد عقیل روبی نے باقاعدہ عملی زندگی کا آغاز محکمہ تعلیم پنجاب میں شرکت کر کے درس وتدریس سے کیا۔ پہلی تقرری مظفر گڑھ ڈگری کالج میں ہوئی۔ کچھ عرصہ صادق ایجرٹن کالج بہاول پور میں گزارنے کے بعد ان کا تبادلہ شیخوپورہ میں ہوگیا جہاں انہوں نے 13 برس تک تعلیمی خدمات انجام دیں۔ 1983ء میں ان کی تقرری ایف سی کالج لاہور میں ہوگئی اور اس درس گاہ سے 2000ء میں ریٹائر ہوئے تو صدر شعبہ اردو کی مسند پر فائز تھے اور لاہور کے ادبی وثقافتی مرکز میں ان کا تشخص شاعری، ناول نگاری، ڈرامہ نویسی، خاکہ نگاری، تراجم اور تنقید وتحقیق کے حوالے سے قائم ہونے لگا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ فلمی نغمہ نگاری کی طرف ریٹائرمنٹ کے بعد آئے تھے لیکن اس وقت تک وہ شعری اظہار پر جدت آمیز قوت حاصل کر چکے تھے۔ ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، شکیل بدیوانی اور آرزو لکھنوی کے فلمی گیت بچپن سے سن رہے تھے اور نہ صرف ان سے متاثر تھے بلکہ یہ بھی کہتے کہ ''ان کے گیتوں میں کلاسیکی شاعری کی روایت موجود تھی، انہیں سن سن کر لفظ اور شعر سے رابطہ بڑھا۔ ان کے حوالے سے ہی فلم اچھی لگنے لگی۔'' خانیوال سے ایف اے کر لیا تو خود بھی گیت لکھنے لگے۔ ایک دن اپنے گیتوں کی کاپی لے کر مصری شاہ لاہور میں قتیل شفائی کے گھر پہنچ گئے۔ گیتوں کی کاپی ان کے سامنے رکھی اور کہا ''یہ گیت میں نے لکھے ہیں اور میں فلم میں گیت لکھ سکتا ہوں''

قتیل شفائی نے پوچھا ''کتنا پڑھے ہو؟''

''میں نے اس سال ایف اے کیا ہے۔'' عقیل روبی نے سر افتخار بلند کر کے کہا۔

قتیل شفائی نے مخلصانہ مشورہ دیا:

''گیت تو تم اس پڑھائی کے ساتھ بھی لکھ لو گے۔ مگر ان گیتوں سے نیک نامی نہیں۔۔۔۔ بدنامی ملے گی۔ اتنی کم تعلیم کے ساتھ جو بات کرو گے، وہ مستند نہیں ہوگی۔ جتنی تمہاری عمر ہے، اتنا میرا تجربہ ہے ...... واپس جا

کر تعلیم جاری رکھو۔۔۔فلمی دنیا جاہلوں کا جنگل ہے۔تم بھی ایسے ہی ہو جاؤ گے۔تعلیم مکمل کر کے آؤ گے تو سب تمہاری بات غور سے سنیں گے۔''

عقیل روبی نے لکھا ہے :

''میں نے کاپیاں اٹھائیں اور ملتان آ کر ایمرسن کالج میں بی اے میں داخلہ لے لیا۔میری زندگی کے سفر میں قتیل شفائی کی یہ پہلی راہنمائی تھی جس نے میری زندگی کا سارا ''سیٹ اپ'' بدل دیا۔ میں نے ایم اے کیا اور کالج میں لیکچرار ہو گیا۔''

قتیل شفائی کا ذکر آتا تو عقیل روبی ان کے اس احسان کا ذکر ضرور کرتے اور انہوں نے اپنی احسان شناسی کی عادت پر بھی عمل کیا اور قتیل شفائی کا شخصی خاکہ لکھا جو ان کی کتاب ''کھرے کھوٹے'' میں شامل ہے۔

عقیل روبی علم و ادب اور فلم میں بٹا ہوا شخص تھا۔سجاد باقر رضوی نے ان کی جملہ سرگرمیوں کو دیکھ کر رائے دی تھی کہ ''آپ آدھے علمی اور آدھے فلمی ہیں'' حسن رضوی نے انٹرویو میں اس جملے پر تبصرے کے لیے کہا تو بولے :

''میں خوش قسمت ہوں، انہوں نے آدھا علمی کہا، ورنہ لکھنے والوں کے اس جنگل میں کچھ ایسے بھی ہیں جو پانچ فیصد بھی علمی نہیں۔باقر صاحب نے میری شخصیت کے تجزیے میں دونوں پلڑے برابر رکھ کر میری عزت رکھ لی ہے۔''

میں عقیل روبی صاحب کی فلمی فتوحات کا شناسا نہیں لیکن یہ جانتا ہوں ان کی ادبی فتوحات غیر معمولی ہیں۔ شاعری میں ان کی پہلی کتاب ''سوکھے پتے، بکھرے پھول'' تھی۔

نظموں کی کتاب کا نام ''سورج قید سے چھوٹ گیا'' ہے۔ ملی جلی آوازیں ''انگریزی نظموں کا مجموعہ ہے۔ ''آخری شام'' کے نام سے ایک منظوم ڈرامہ بھی چھپ چکا ہے۔ سوانحی زاویے سے ناصر کاظمی، سجاد باقر رضوی، ممتاز مفتی اور نصرت فتح علی خان پر انہوں نے اپنے اسلوب کی مثالی کتابیں لکھیں۔ ناول نگاری کی طرف آئے تو۔۔۔ ''چوتھی دنیا''۔ ''بنجر دریا''۔۔ ''ساڑھے تین دن کی زندگی''۔۔۔ ''جنگل کتھا''۔ ''فاہیان''۔۔۔اور ''آدھی صدی کا خواب'' جیسے ناول لکھے جن میں زندگی۔ ماضی اور حال کے تناظر میں سفر کرتی ہے اور یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی لازم ہو جاتی ہے کہ عقیل روبی ناول نگاری کے فن میں بھی معجز قلم تھے۔ عقیل روبی کو یونان کے اساطیری مطالعے میں خصوصی دلچسپی تھی۔ انہوں نے اس دور کے علم و دانش کے معماروں کا مطالعہ کیا تو محسوس کیا کہ زمانہء حال انہیں یونانی دانشوروں کی علمی اور فکری روشنی سے منور تھا اور ملال کیا کہ ان سے پورا استفادہ نہیں کیا جا رہا تھا۔ عقیل روبی نے اپنا رخ یونان کی طرف کیا تو یونانی شاعری کا ترجمہ 'بلائی ٹس'' کے عنوان سے کیا اور ایک کتاب شائع کی۔ پھر سوفیکلو کے ڈرامے ''ایڈیپس'' اور یوری پیڈز کے ڈرامے ''میڈیا'' کو ترجمے کے وسیلے سے اردو کی صورت دی۔ ہومر، ارسطو، سقراط، سفیو اور سونوکلیز پر تنقیدی نظر ڈورائی تو ایک کتاب ''یونان کا ادبی ورثہ'' کے نام سے پیش کر دی۔ ضیاء محی الدین نے ان کے تراجم دیکھے تو کہا کہ ان یونانی ڈراموں کو ہم اپنے اسٹیج سے پیش کریں گے۔ یونانی ادب کا ذکر آئے تو رحمٰن مذنب بہت یاد آتے ہیں کہ انہوں نے دانش یونان کو پاکستان میں متعارف کرانے کے لیے بہت محنت کی تھی۔ لیکن اب عقیل روبی صاحب کے مجموعی کام پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ رحمٰن مذنب سے بھی آگے نکل گئے ہیں اور مطالعہ یونان میں اتنے ڈوبے ہوئے تھے کہ یار لوگوں نے اس حوالے سے فقرے بازی شروع کر دی اور انہیں ''عقیل روبی یونانی'' کہنے لگے۔ وہ سنتے تو برا نہ مانتے لیکن مسکرائے بغیر بھی نہ رہتے۔ اور عینک کا زاویہ درست کر کے پڑھنے میں یا لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ میں نے ان کی کتاب ''علم و دانش کے معمار'' دیکھی تو میرا جی یاد آئے جنہوں نے آزادی سے قبل مشرق

اور مغرب کے چند ممتاز شاعروں پر تجزیاتی مضامین اردو کے ممتاز رسالہ ''ادبی دنیا'' میں لکھ کر اپنی دھاک بٹھادی۔ عقیل روبی نے بھی میراجی کے نقوش پا پر ہی سفر کیا ہے، لیکن ان کی تحقیق وتنقید کے مدار میں صرف شعراء ہی نہیں آئے بلکہ انہوں نے ادب کے علاوہ فلسفہ، تاریخ اور سائنس کی عہد ساز شخصیات پر بھی ان کے افکار، نظریات اور تجربات کے حوالے سے مضامین لکھے اور اس حقیقت کو ثابت کیا کہ یہ ہر عہد کے زندہ لوگ تھے۔ عقیل روبی صاحب کا اپنا بیان ہے:

''اس کتاب ''علم ودانش کے معمار'' میں جن لوگوں پر میں نے لکھا ہے، ان کا میرے ہاں طویل عرصے سے آنا جانا رہا ہے۔ ان کی باتیں سن کر، انہیں پڑھ کر، جو کچھ یاد رہا میں نے لکھ دیا ہے۔''

عقیل روبی نے جن انگریزی شعراء کی نظموں کے اقتباس اس کتاب میں شامل کیے ہیں، ان کا منظوم ترجمہ بھی خود کیا ہے اور ان میں تخلیقی شان پیدا کی ہے۔ ممتاز انگریزی شاعر ٹی۔ ایس۔ کولرج کی شہرۂ آفاق نظم ''قبلائی خان'' کی آخری دو سطریں حسبِ ذیل ہیں:

Under The Waining Moon
The Devil's Lover Weeps

عقیل روبی نے اسے اُردو میں یوں منظوم کیا ہے:

جیسے گھٹتے چاند کے نیچے زنِ فرقت زدہ
عاشقِ بدروح کی خاطر کرے آہ و فغاں

شیلے کی مشہور نظم ''مغربی ہوا سے'' (0de to the westwind) کو اس تخلیقی رعنائی سے اردو کا روپ دیا کہ یہ عقیل روبی کی منظوم ترجمہ نگاری کی مثال قرار دی جاسکتی ہے۔ جزوی اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

مغربی سمت سے آتی ہوئی اے وحشی ہوا
تیری موجوں، تیری لہروں کی سبک گامی سے

آسمانوں کی ترائی میں ۔۔۔۔خلل آیا ہے
برق وباراں کے فرشتے تری ان موجوں میں
ایسے بکھرے ہیں کہ جیسے کوئی بے خود داسی
جذبہء جوش عبادت میں کرے رقص جنوں

اس کتاب کے مضامین پڑھ کر مجھے محسوس ہوا کہ عقیل روبی نے دانشوران عالم کی روح کو اپنے جسم وجاں میں اتار کر یہ مضامین لکھے ہیں۔اس لیے ان کا تاثر بھی عارضی نہیں عوامی ہے۔ اور ہوریس نے جو الفاظ ہومر کے بارے میں کہے تھے،اب بہ ترمیم یوں لکھے جاسکتے ہیں:

''ہر لکھنے والے کو اپنے دن رات اس کتاب (علم ودانش کے معمار) کے ساتھ بسر کرنے چاہئیں''

عقیل روبی نے ادب کو تعصب کی عینک اتار کر پڑھا اور اپنی رائے اپنے مطالعے کی روشنی میں فطری آزادی سے قائم کی۔انٹرویو لینے والے انہیں سوالات کے گورکھ دھندوں میں الجھانے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے لیکن عقیل روبی اپنی سوچ کے حاصل کو جانبدارانہ عصبیت سے آلودہ نہ ہونے دیتے اور ایسا بیان دیتے جس پر زمانی صداقت کی لہر دیکھی جاسکتی ہے۔ان کے خیال میں:

''جو لکھنے والا اپنے عصری تقاضوں اور سماجی ذمہ داریوں کو اپنی تحریروں میں نبھاتا ہے وہ جدید ہے۔''

''جدیدیت خلاؤں میں نہیں پلتی،قدیم روایات کی جڑوں سے پھوٹتی ہے۔''

''مزاحمتی ادب اور شاعری باہمت انسانوں کی جدوجہد۔۔۔ظالم کے ظلم۔۔اور مظلوموں کی برداشت کی تاریخ مرتب کرتی ہے۔''

''تنقید۔۔۔تخلیق کی مرہون منت ہے۔ادب وشعر میں نیا تجربہ، تنقید

کو آگے بڑھاتا ہے۔''

''کتابوں کی تقریب رونمائی ، اور مختلف گھریلو انجمنوں نے تنقید اور تخلیق دونوں کو معیار سے گرادیا ہے۔ کتابوں کے فلیپ اتنی کاری گری سے لکھے جاتے ہیں کہ اگر شاعر کا نام بدل دیا جائے تو ہر کسی کی شاعری پر پورا اترتا ہے۔''

''نثری نظم کا اپنا ایک مزاج ہے۔ ایک لہجہ، ایک فکری اسلوب ہے، اور پھر شاعری کے لیے وزن ضروری نہیں۔ افلاطون کے ڈائیلاگ کو بہترین شاعری قرار دیا گیا ہے اور یہ نثر میں ہیں۔۔''

''غزل میں طے شدہ مضامین کے علاوہ کسی نئے مضمون کا دخل غزل کی توہین سمجھا جاتا ہے۔ گھسے پٹے مضامین کے تولیے دھو دھلا کر اظہار کی کھونٹیوں پر ٹانگنے سے تخلیقی عمل آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس لیے تنقید بھی ہمارے ہاں لنگڑا لنگڑا کر چل رہی ہے۔''

''انشائیہ؟۔۔۔۔ سردیوں میں آتش دان کے اردگرد بیٹھ کر زندگی کے ہر مسئلے کے بارے میں فلسفیانہ انداز میں گفتگو جو زیادہ بوجھل بھی نہ ہو اور نہ حد سے زیادہ طویل۔ ایسی گفتگو جو دن بھر کی تھکن کو زائل کردے۔''

اور اب ادبی شخصیات کے بارے میں عقیل روبی کی رائے جس میں ان کا ذاتی مشاہدہ شامل ہے:

''فیض صاحب اور ندیم صاحب کی شرافت اور دھیماپن ان کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ فیض صاحب نے کبھی دشمنوں کی بات کا جواب نہیں دیا۔ مسکرا

کرسب کو مٹی میں ملا دیا۔ ندیم صاحب نے محبت سے کئی جنگیں جیتیں''۔

''ڈاکٹر وحید قریشی صاحب مثالی استاد اور راہنما ہیں، جس شاگرد میں چابی بھری، اسے بولنا سکھا دیا''۔

''حسن عسکری صاحب نے اپنے منفرد اور مخصوص لب ولہجہ سے تنقید کو تخلیق بنا دیا''۔

''ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کا اسلوب گھٹن میں تازہ ہوا بن کر چلا''۔

''انیس ناگی کے اندر طربیہ نگار سٹوفینز کی روح رقصاں ہے۔ جو اپنے عہد کے ادیبوں پر لاٹھی چارج کرنے میں مشہور تھا۔ انیس ناگی نہ مصلحت سے کام لیتا ہے، نہ منافقت سے۔ صرف قلم سے کام لیتا ہے۔ اسی لیے اکثر ادیب اس سے نالاں رہتے ہیں''۔

احمد عقیل روبی آدمیوں کے ہجوم میں ایک منفرد قسم کے انسان تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی لوح وقلم کی خدمت میں گزاری۔ ادب کی جس جہت میں قدم رکھا اس میں اپنی انفرادیت کا نقش قائم کیا۔ انتظار حسین نے ان کے وفات نامے میں لکھا کہ ''جو مضمون زیر بحث آیا اس میں عقیل روبی رواں ہو گئے۔ سو ہفت رنگ تو بن گئے لیکن اس کے ساتھ بکھر بھی گئے۔'' ان کا اپنا خیال تھا کہ آدمی کی گلیشیر کی طرح مختلف سکیمیں ہیں مختلف ذوق ہیں، شاید میں ان تمام راستوں پر چلنا چاہتا ہوں جو میرے اندر پھیلے ہوئے ہیں، اس امید پر کہ شاید کسی دن منزل تک پہنچ جاؤں''۔۔۔۔ ان راستوں میں سے ایک انہیں قرآن مجید کی منظوم فہم آرائی کی طرف لے گیا۔ اس مقدس کام کا آغاز تیسویں پارے سے کیا کہ اجل کا پیغام آ گیا۔ اور عقیل روبی دنیا سے اٹھ گئے۔ راوی بیان کرتا ہے کہ وہ ایک برس سے کینسر جیسے موذی مرض سے نبرد آزما تھے۔ ڈاکٹروں کے مطابق علاج صحیح سمت میں ہو رہا تھا اور واقعی 23 نومبر 2014ء کو انہوں نے بیماری سے دائمی نجات حاصل کر لی۔

افتخار اجمل شاہین

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو دوسری طرف کراچی سے محترمہ عذرا اصغر بول رہی تھیں۔ میری آواز سن کر انہوں نے پہلا سوال کیا ''آپ پروفیسر افتخار اجمل شاہین کو جانتے ہیں؟''

میں نے جواب دیا 'جی ہاں، میں انہیں اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ ڈھاکہ سے دوسری ہجرت کر کے کراچی آئے تھے اور سراج الدولہ گورنمنٹ کالج میں اردو کے استاد کی حیثیت سے ان کی تقرری ہوئی تھی اور وہ ڈاکٹر فہیم اعظمی کے رسالہ ''صریر'' میں تنقیدی مضامین کے علاوہ نظمیں اور غزلیں لکھتے تھے۔ پچھلے چند ماہ کے دوران میں ان کے ساتھ ٹیلی فون کا رابطہ قائم ہو گیا تھا۔ چند روز قبل ان سے موبائل فون پر ایک طویل گفتگو ہوئی تھی اور انہوں نے بتایا تھا کہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کا ''جشن اردو'' پنجاب کا ایک نیا شاعر علی اکبر ناطق لوٹ کر لے گیا ہے۔''

عذرا اصغر یہ سب باتیں سنتی رہیں اور جب میں نے پوچھا:

''آج آپ خاص طور پر افتخار اجمل شاہین کا کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

غم زدہ آواز میں جواب آیا ''ان کا انتقال ہو گیا ہے'' اور پھر انہیں ایک لمبی چپ لگ گئی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں افتخار اجمل شاہین کی ذاتی زندگی کا شناسا نہیں تھا۔ ہمارے درمیان قدر مشترک اردو ادب تھا۔ ان کے بھی رشتے دار چونکہ ہندوستان میں بھی آباد تھے (ممتاز شاعر اور نقاد ڈاکٹر ارمان نجمی ان کے قریبی عزیز ہیں اور ان دنوں پٹنہ میں مقیم ہیں) اس لیے وہ اس ملک کی ادبی سرگرمیوں سے باخبر رہتے تھے اور مجھے بھی باخبر رکھتے تھے۔ میں نے مرحوم کے پسماندگان کا پوچھا تو عذرا اصغر نے جواب دیا:

''ان کی بیگم کچھ عرصہ پہلے وفات پا گئی تھیں۔ صدر شعبہ اردو کی حیثیت میں مدت ملازمت پوری ہو جانے پر 2006ء میں ریٹائر ہو گئے تھے۔ اب ادب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ بیگم زندہ تھی تو مختصر غزل لکھا کرتے تھے۔ بیگم کی وفات کے بعد طویل تنقیدی مضامین لکھنے لگے تھے۔ آخری مضمون الحمراء لاہور کے فروری 2011ء کے پرچے میں چھپا۔'' ان کے سب بچے ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔''

اب میں نے اپنی یادوں کو کریدا تو کراچی میں ان سے ایک طویل ملاقات یاد آ گئی۔ کراچی والوں نے ایک نامور ادیب کی کتاب کی رونمائی کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا اور اس ناچیز انور سدید کو یاد فرمایا تھا۔ تقریب کے دوسرے روز ڈاکٹر فہیم اعظمی صاحب نے ہم دونوں کو اپنے گھر پر مدعو کیا تو وہاں افتخار اجمل شاہین بھی موجود تھے۔ میں ان کے نام اور کام سے آشنا تھا۔ فہیم اعظمی صاحب نے ان کی اضافی خوبی یہ بتائی کہ وہ ماہنامہ ''صریر'' میں ان کے قلمی معاون ہی نہیں تھے بلکہ ''صریر'' کی ترتیب و تدوین میں بھی معاونت کرتے تھے، لیکن سرورق پر اپنا نام لکھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ انہیں دنوں ایک کتاب پر افتخار اجمل شاہین نے بڑی تفصیل سے تجزیاتی تبصرہ لکھا تھا۔ میں نے اس کا ذکر کیا تو ان کی آنکھیں چمک اٹھیں اور پھر بڑی آہستگی سے بولے:

''مجھے کراچی کے ادیبوں نے کبھی گھاس نہیں ڈالی..... قدر افزائی کی ہے تو صرف ڈاکٹر فہیم اعظمی نے۔''

اور فہیم اعظمی صاحب سے نظریں چرا کر بولے:

''اور اعظمی صاحب بھی تو اس شہر میں اجنبی ہی ہیں۔ ان کے ناول ''جنم کنڈلی'' پر آپ نے تبصرے پڑھے ہیں؟ کراچی کے سب نقادوں نے انہیں ''کلین بولڈ'' کر دیا ہے۔ صرف وزیر آغا صاحب نے ''اوراق''

میں اس ناول پر تبصرہ چھاپا تو اسے منفرد قرار دیا لیکن جب فہیم اعظمی
صاحب نے اپنا رسالہ ''صریر'' جاری کر دیا تو سب ان کی تعریف میں
رطب اللسان ہو گئے۔''

افتخار اجمل شاہین کا یہ تبصرہ ادبی معاشرے کی سیاست اور ادیبوں کے رویے کے
عین مطابق تھا۔لیکن فہیم اعظمی کو گوارا نہ تھا۔اس لیے انہوں نے موضوع کو تبدیل کر دیا۔اس
بے تکلف ادبی محفل میں گفتگو ''بے مرکز'' تھی۔افتخار اجمل شاہین اور میں اس کے خاموش سامع
تھے اور تبادلہ خیالات ڈاکٹر وزیر آغا اور فہیم اعظمی کے درمیان ہو رہا تھا۔تاہم افتخار اجمل شاہین
کو جب موقع ملتا وہ شگوفہ پیدا کر کے محفل کو ''کشت زعفران'' بنا دیتے۔لاہور واپس آ کر میں
نے اپنی نئی کتاب ''1998ء کی ادب کہانی'' فہیم اعظمی صاحب کو بھیجی تو فرمائش کی کہ اس پر تبصرہ
افتخار اجمل شاہین صاحب سے کرائیں۔فہیم اعظمی نے جواب دیا کہ وہ تبصرہ لکھنے پر آمادہ ہیں
لیکن شکایت کرتے ہیں کہ ایک سال کے ادب کی سب اصناف کے اس طویل ترین جائزے میں
افتخار اجمل شاہین کا نام تک کہیں نہیں آیا اور ان کا ذاتی تاثر یہ تھا کہ افتخار اجمل شاہین اس کتاب
کو دیکھ کر افسردہ ہو گئے ہیں۔

یہ بات بر سبیل تذکرہ میں نے لکھ دی ہے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے تبصرہ لکھا
تھا اس کتاب کو جائزہ نگاری کی منفرد کتاب قرار دیا اور کچھ ایسے اسمائے تفضیل بھی استعمال کیے
کہ میں نہ قبول کر سکتا تھا اور نہ انہیں مسترد کر سکتا تھا لیکن یہ ایسا تبصرہ تھا جو مزید لکھنے کی تحریک دیتا
ہے اور سابق تحریروں پر اعتماد عطا کرتا ہے۔

اب اس تعزیتی مضمون کے لیے مجھے افتخار شاہین کے حالات حیات کی جستجو ہوئی تو
''دبستانوں کا دبستان۔۔۔کراچی'' کے مصنف جناب احمد حسین صدیقی نے میری معاونت کی۔
انہوں نے بتایا کہ افتخار اجمل شاہین بھارت کے صوبہ بہار کے شہر پٹنہ (عظیم آباد) میں 1944ء
پیدا ہوئے تھے۔1962ء میں جامعہ پٹنہ سے ایم اے کرنے کے بعد وہ مشرقی پاکستان آ گئے اور

ڈھاکہ اور چٹا گانگ میں درس وتدریس کی خدمات انجام دیں۔ چٹا گانگ کی یادیں چنداں خوش آئند نہیں تھیں۔ کبھی کبھی موج میں آتے تو مغربی پاکستان کے ان افسروں کی داستانیں سناتے جو مشرقی پاکستان میں اپنی اجنبی آوارگیوں سے نفرت کے بیج بو رہے تھے اور اس صوبے کی علیحدگی کا باعث بن رہے تھے۔ سول سروس کے ایک ایگزیکٹو افسر کے ذکر پر ان کے لہجے میں تلخی آجاتی کہ یہ افسر چکمہ قبیلے سے ن۔م۔ راشد کی ایک نظم کے مطابق انتقام لیتے اور اپنی ''فتوحات'' فخر سے بیان کرتے تھے۔ سقوط ڈھاکہ ان کی زندگی کا دردناک مشاہدہ تھا۔ 1972ء میں وہ کراچی آگئے اور 1976ء میں پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کر کے باقاعدہ لیکچرار بن گئے۔ ادب سے لگاؤ تو پٹنہ میں طالب علمی کے زمانے میں ہی پیدا ہو گیا تھا لیکن اس کی پرورش ڈھاکہ کے قیام کے دوران باضابطہ انداز میں ہوئی۔ 1962ء میں ان کے مضامین اور شاعری ملک کے مقتدر ادبی رسائل میں باقاعدگی سے چھپنے لگی تھی۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ ''عقیدت کا سفر'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔۔۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں:

○

شاہین یہ ہوتا چلا آیا ہے ازل سے — رتبہ کوئی ملتا ہے تو بس حسن عمل سے
محبوب خدا کی ہے محبت جسے حاصل — ڈرتا نہیں اللہ کا بندہ وہ اجل سے

○

عنایت کی ہم پہ نظر بن کے آئے — کڑی دھوپ تھی وہ شجر بن کے آئے
گئی عظمت شب، وہ پھیلا اجالا — جہاں میں پیام سحر بن کے آئے

افتخار اجمل شاہین کی شاعری کا ایک مجموعہ موضوعاتی نظموں پر مشتمل ہے اور وہ ''رنگ وبو کا سفر'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ غزلوں کا مجموعہ ''شاعری کا سفر'' کے نام سے موسوم ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

شاد ہم کو جو خوبرو کرتے — ہم بھی جینے کی آرزو کرتے
تم بھی پڑھنے لگے نماز عشق — پہلے لازم یہ تھا وضو کرتے

اس کی چاہت نکال دی دل سے
دل کو کب تک لہو لہو کرتے
کشتہء آرزو ہیں ہم شاہین
لوگ کیسے ہیں آرزو کرتے

ان کے تنقیدی مضامین کی دو کتابیں 'آگہی کا سفر'' کے نام سے چھپیں۔ شاعری سے ان کی ہم آہنگی فطری تھی اور غزل ان کی پسندیدہ صنف سخن تھی لیکن ڈاکٹر فہیم اعظمی سے دوستی کے زمانے میں وہ ''صریر'' کے دفتر میں آنے والی سب کتابیں پڑھتے تھے اور ان پر نقد و تبصرہ بھی کرتے تھے۔ تخلیقی سطح پر افسانہ بھی ان کی محبت تھی۔ چاٹ گام کے قیام کے دوران انہوں نے جو افسانے لکھے وہ مغربی پاکستان کے رسائل میں چھپتے رہے۔ لیکن پھر انہیں یہ احساس ہوگیا کہ وہ افسانے کے مرد میدان نہیں اور اس خیال کے ساتھ ہی انہوں نے نہ صرف افسانہ نگاری ترک کردی بلکہ اس وقت تک جتنے افسانے لکھے تھے، ان کی حفاظت بھی نہ کی اور یہ افسانے وقت کی گرد میں گم ہو گئے۔ لیکن ''صریر'' میں افسانوں کی کتابوں پر تبصرے لکھے تو ان کے فطری ذوق نے ان کی راہنمائی کی اور انہوں نے ابوالفضل صدیقی، قرۃ العین حیدر، شہناز پروین، شیر شاہ سید، آغا گل، شاہد کامرانی کے فن پر تنقیدی نظر ڈالنے کی کاوش بھی کی۔ اور اردو افسانے پر مجموعی نظر ڈالی تو ''کہانی لکھتی ہے یا لکھی جاتی ہے''۔۔۔ ''ہمارے افسانہ نگار اور عصری وعلاقائی تقاضے''۔۔۔ ''پاکستان میں اردو افسانہ نگاری، ایک جائزہ''۔ اور ''اردو افسانے کا مستقبل'' جیسے مضامین بھی لکھے۔ یہ سب مضامین ان کی کتاب ''اردو افسانہ اور چند افسانہ نگار'' میں شامل ہیں۔ افتخار اجمل شاہین نے مشرقی پاکستان کے شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ لکھنے کا منصوبہ بھی بنایا تھا۔ اور اس کا عنوان ''تذکرہ دبستان خاور'' بھی طے کرلیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری ''پردۂ ذہن پر ابھرتے ہیں'' کے نام سے لکھ رہے تھے لیکن موت نے مہلت نہ دی۔

افتخار اجمل شاہین کے باطن میں ایک غنی مزاج، درویش طبع اور استغنا پسند ادیب پرورش پا رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عارضی شہرت عطا کرنے والے تکیوں سے کنارہ کشی اختیار کی اور اپنی انجمن خود اپنی خلوت میں سجائی۔ اپنی تحریر کو خود اپنے اعتماد سے سرفراز کیا لیکن وہ

دوسرے ادیبوں سے معاونت کشادہ نظری سے کرتے اوران کے ادبی منصوبوں کی تکمیل میں شامل ہوجاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ سید فخرالدین بلے مرحوم کے چند دوست علی گڑھ سے کراچی آئے اور انہوں نے بلے صاحب پرایک کتاب مرتب کرنے کاارادہ ظاہر کیا تو افتخار اجمل شاہین اس کتاب کے لیے مضامین حاصل کرنے کے لیے سرگرم عمل ہو گئے اور جس کسی نے مضمون لکھنے کے لیے مواد طلب کیا اسے زیراک کاپیاں بھجوائیں۔ افتخار اجمل شاہین اپنی ادبی معلومات کو بھی ہمیشہ ''اپ ٹوڈیٹ'' رکھتے تھے۔ ڈاکٹر انور محمود خالد فیصل آباد سے کسی طویل ''ٹیلی فون کال'' کا ذکر کرتے اور دریافت کی گئی معلومات کی تفصیل بتاتے تو میں فوراً کہہ اٹھتا ''یہ فون افتخار اجمل شاہین کا ہوگا'' ڈاکٹر انور محمود خالد کہتے ''ہاں، انہیں کا تھا''۔۔۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات کے بعد ''فنون'' کی زیارت موقوف ہوگئی تھی۔ افتخار اجمل شاہین کو جب معلوم ہوا کہ میں شیاٹیکا پین کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہوں اور کتابوں کی دکان تک پہنچ نہیں سکتا تو انہوں نے ''فنون'' ہی نہیں چند دوسرے اہم رسائل بھی فراہم کرنے کا انتظام کردیا۔ میں ان کی قیمت ادا کرنے کی درخواست کرتا تو مسکرا کرٹال دیتے اور کہتے ''حساب دوستاں دردل''۔۔۔ میرا ذاتی دکھ یہ ہے کہ میں افتخار اجمل شاہین کی وفات سے ایک ایسے مخلص دوست سے محروم ہوگیا ہوں جس کے تمام انداز کریمانہ تھے۔

انجم رومانی

انجم رومانی سے میری پہلی ادبی ملاقات آزادی کے بعد ایک ریڈیو مشاعرے میں ہوئی تھی۔ جس کا میں سامع تھا۔ قتیل شفائی جب اپنی غزل ترنم میں پڑھ چکے تو انجم رومانی کا نام پکارا گیا اور بتایا گیا کہ انجم صاحب حلقہ ارباب ذوق لاہور کے سرگرم رکن ہیں لیکن وہ ریاضی کے استاد ہیں اور دیال سنگھ کالج لاہور میں پڑھاتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ قتیل شفائی کی غزل اور ان کے ترنم کے بعد شاید کوئی شاعر مشاعرے میں جم نہ سکے لیکن عجیب واقعہ ہوا کہ مطلع پیش کرنے سے پہلے انجم رومانی پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور یہ اتنا شدید تھا کہ قتیل شفائی کا ترنم کھانسی کی طویل مسلسل کھوں کھوں میں ڈوب گیا اور انجم رومانی نے غزل روانی سے تحت اللفظ میں پڑھی تو اس پر اٹھنے والی داد بھی ریڈیو سے سنائی دیتی رہی۔ مجھے یہ غزل اتنی پسند آئی کہ اس کا مقطع دل پر نقش ہو گیا۔ آپ بھی سنیئے:

تاروں پر انجم کے سوا، کون نظر دوڑائے گا دنیا محوِ انساں ہے اور انساں محوِ دنیا ہے

میں نے اندازہ لگایا کہ اس شاعر کو فلکیات میں دلچسپی ہے اور وہ عصری تقاضوں کے برعکس ستاروں کی چال کا مطالعہ شاید زیادہ غور سے کرتے ہیں۔ بعد میں ان کی شاعری سے ادبی رسائل میں تفصیلی تعارف ہونے لگا تو مجھے محسوس ہوا کہ ان کی شاعری میں اپنی ذات سے بیگانگی کا رویہ نمایاں ہے اور وہ افقی لکیر پر قدم رکھتے ہوئے منزل کو پالینے کی بجائے عمودی سمت میں نظر دوڑاتے ہیں اور ان ہیولوں کو پکڑنے کی سعی کرتے ہیں جو خلاؤں میں تیر رہے ہیں۔ یہ ہیولے بھی تاریکی پھیلاتے ہیں اور کبھی روشنی کی چمک عقب سے نکل آتی ہے۔

پردۂ ذہن پہ اس گیسوئے رقصاں کا فسوں صورت سایۂ صد کاہکشاں باقی ہے

معاملات جہاں کی خبر ہی کیا اس کو | معاملہ ہی کسی سے رکھا نہ رکھتا ہے
ہوئے رخصت انجم سحر کے قریب | نہ دیکھا گیا شاید اپنا مآل

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک قادرالکلام شاعر کی حیثیت میں انجم رومانی نے اپنے گردوپیش کو نظرانداز نہیں کیا۔ بلکہ اپنے عصر رواں کو ہمیشہ تنقیدی زاویوں سے دیکھا۔

مری کائنات ایک حیرت کدہ | مقدر میں جس کے نہیں اندمال
لکھی جائے گی یہ تاریخ کے اوراق میں بات | نعمت اِک ہم کو ملی تھی پہ سنبھالی نہ گئی
جھوٹ کو خوب ہوا دی جائے | سچ کی تحریک دبا دی جائے

عجیب بات ہے کہ انجم رومانی جن کا پیدائشی نام فضل دین تھا، رزق ریاضی جیسے خشک مضمون کی تعلیم میں لکھا تھا لیکن شاعری انہیں فطرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی اور انہوں نے دونوں کیساتھ وفا اس خلوص سے کی کہ ریاضی کے مضمون سے اپنی منکوحہ جیسا سلوک کیا لیکن شاعری کو محبوبہ کا درجہ دیا۔ اس دور میں اختر شیرانی کی رومانی شاعری کا بہت چرچا تھا۔ ہر ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر نے ایک خیالی محبوبہ کو اپنی پسند کا نام دے کر اپنی شاعری کا مرکز بنا رکھا تھا۔ اختر شیرانی کی محبوبہ سلمیٰ تھی جوان کی نظموں میں اگرچہ زمانے کی نظروں سے چھپ کر شاعر سے ملنے کے لیے وادی میں آتی تھی لیکن شاعر کو اپنے استقبال کے لیے پورے انتظامات کراتی اور اپنے وجود کا احساس دلاتی تھی۔ الطاف مشہدی نے اپنی محبوبہ کا نام ''ریحانہ'' رکھا ہوا تھا۔ رفیق خاور برملا کہتے تھے ''زہرہ نے میرا سکھ چھینا''۔

انجم رومانی نے اختر شیرانی سے پابند نظم کی ہیئت حاصل کی اور بڑی توانا نظمیں لکھیں لیکن غزل کا دامن بھی تھامے رکھا اور افلاطونی عشق کی پرورش کی۔ تصدق حسین خالد، عطاءاللہ سجاد، ن۔م۔راشد اور میراجی نے آزاد نظم کو فروغ دیا تو انجم رومانی نے اظہار ذات کے لیے اس ہیئت کو بھی قبول کیا جس کی ایک وجہ میرے نزدیک یہ بھی ہے کہ لاہور میں آزاد نظم کا سب سے بڑا پلیٹ فارم حلقہ ارباب ذوق تھا جس میں میراجی نے شمولیت کی تو پابند نظم پس منظر میں چلی گئی اور آزاد

نظم جو مصرعوں کی یکساں طوالت اور ردیف وقوافی کی جامد پابندی کو قبول نہیں کرتی تھی نوجوانوں میں مقبول ہوتی چلی جارہی تھی۔ اس وقت انجم رومانی عروض و بحور کا ریاض کر چکے تھے اور شعر کہنے لگتے تو غیب سے مضمون قافیے میں گندھا ہوا اترنے لگتا۔ انجم رومانی نے قادرالکلامی کے اس عالم میں آزاد ہیئت کو بھی بڑی خوبی اور خوبصورتی سے استعمال کیا۔ اس کی ایک نمائندہ مثال ان کی نظم ''برزخ'' ہے۔

کیسے دروازہ کھلا؟

اور کس طرح در آیا میرا سایہ، میرے پیکر کے نہاں خانے میں

میں تو خوابیدہ تھا..... دروازہ کھلا.... آنکھ نے دیکھا...... لیکن

کس طرح آنکھ نے دروازے کو کھلتے دیکھا؟

چشم واگشتہ نے دروازے کو کھلتے دیکھا

ذہن بیدار نے ہر بات کو محسوس کیا

جیسے ماضی مرا بیراگی ہے

جس کی بھوری سی لٹیں

جسم خوابیدہ پہ منڈلاتی ہیں اور یہ سوچ رہی ہیں کہ اسے

اپنا ہم رنگ بنالیں، لیکن

دیکھتے دیکھتے دروازہ کھلا

ایک دروازے کے کھلنے سے کئی اور بھی دروازے کھلے

اور پھر ایک ہی دروازہ تھا۔۔۔ حیراں نگراں

جیسے کسی ہیئت داں سے چاند تاروں کی تفاصیل نے

اور دنیا میں اکیلا رہ جائے (برزخ)

یہ نظم ظاہر کرتی ہے کہ انجم رومانی کو موضوع کی روانی میں اپنے مافی الضمیر کے بیان

پر پورا عبور حاصل تھا اور ان کے مصرعوں کا اختصار یا طوالت بھی نظم کی داخلی کیفیت کے مطابق ہوتی تھی۔ دوسری طرف میں ان کے تخلیقی مزاج کو بحور ہی نہیں قوانی کا پابند بھی دیکھ سکتا ہوں اور ان کی اکثر نظمیں اپنی ہیئت خود تراشتی ہیں۔ اس کی ایک مثال حسب ذیل نظم ہے جس کی سب سطریں بحر کی پابند ہیں اور قوانی سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

کسی موہوم دوشیزہ کی عریاں بانہیں
حمائل میری حسرت کے گلے میں اب بھی ہوتی ہیں
طاقوں سے پرے ٹھٹھری ہوئی راتیں زمستاں کی
نشیلی چاندنی کے پھول پہنے اب بھی روتی ہیں نہیں ہے آج بھی کوئی یہ آنسو پوچھنے والا
نہ کوئی سیم گوں پیکر نہ کوئی نیلگوں سایہ مری بانہوں میں تنہائی کی روحیں سرسراتی ہیں
تہی انگڑایاں بن بن کے راتیں اڑتی جاتی ہیں ستارے ٹوٹتے ہیں، نور برساتے ہیں۔ برساتیں
دھندلے دامن دل کھینچتے ہیں..... کھینچتے جائیں
(انگڑائیاں)

انجم رومانی متحدہ ہندوستان کی ریاست کپورتھلہ میں 20 دسمبر 1920ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور سے 1943ء میں ریاضی میں ایم اے کا امتحان امتیاز سے پاس کیا لیکن شاعری کی طرف فطرت نے رجحان بچپن میں ہی موڑ دیا تھا۔ سکول کی کتابیں پڑھتے تو نظمیں یاد کر لیتے اور بزم ادب میں زبانی سناتے۔ شاعری کی خوشبو گھر میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔ نانا قادرالکلام شاعر تھے۔ ماموں مشاعرہ پڑھتے تھے تو ہر شعر پر داد پاتے۔ ان کی والدہ کو مثنویوں کے ٹکڑے ازبر تھے۔ یہ ٹکڑے ماں نے بیٹے کو بھی یاد کرا دیے۔ سکول کی بزم ادب میں پڑھتے تو اساتذہ ان کی تحسین کرتے۔ ایک روایت کے مطابق انہوں نے میر تقی میر، میرزا غالب اور مومن خان مومن کو سکول کے زمانے میں پڑھ ڈالا تھا اور مرزا داغ کی غزل کو اپنے دل میں خاص مقام دیا تھا۔ سکول کی بزم ادب کی تربیت نے انجمن سازی کے شوق کی افزائش کی۔ ماموں ستارہ شناس تھے۔ رات کو ستاروں کی چال کا مطالعہ کرتے تو اس مطالعے کو اپنی ذات تک محدود

نہ کرتے بلکہ فضل دین کو بھی..... جو ابھی انجم رومانی نہیں بنے تھے سمجھاتے تھے۔ یہ دلچسپی بعد میں فلکیات کے مطالعے کے شوق میں ظاہر ہوئی۔ آخری دور میں حسین مجروح صاحب حلقہ اربابِ ذوق کے ارکان کا ایک وفد لے کر ان کے گھر پر حاضر ہوئے تو انجم رومانی نے اپنی یادوں کو کرید کر بتایا کہ انہوں نے اپنے جیب خرچ سے ایک دوربین خریدی تھی لیکن ستاروں کا اسرار ان کی دانش سے بلند تھا۔ بس ستاروں کو حرکت کرتا ہوا دیکھتے اور خوش ہوتے رہتے تھے۔

انتظار حسین نے اخبار ''مشرق'' میں ان پر کالم لکھا تو بتایا کہ ''انجم رومانی کے آباؤ اجداد لال قلعہ کے رہنے والے تھے۔ لال قلعہ سے کتنے شہزادے، شہزادیاں 1857ء میں نکلے اور خاک بسر ہوئے۔ بے چارے انجم رومانی کے اجداد اس سے کچھ پچاس پچپن برس پہلے ہی قلعہ سے نکل پڑے۔ غلام قادر روہیلہ کے خوف سے اور چھپتے چھپاتے کپورتھلہ پہنچے۔ یہاں سے یہ خاندان 1947ء میں اکھڑا لیکن انجم رومانی تشکیل پاکستان سے پہلے ہی لاہور آ گئے تھے۔ ایم اے کرنے کے بعد پنجاب سیکرٹریٹ میں ملازمت مل گئی اس لیے واپس کپورتھلہ نہیں گئے۔ دفتری ملازمت راس نہ آئی تو محکمہ تعلیم میں معلّمی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ جالندھر، ملتان اور منٹگمری کے کالجوں میں طلباء کو ریاضی کی تعلیم دی۔ کچھ عرصہ پنجاب یونیورسٹی کی آبزرویٹری میں بھی گزارا لیکن 1948ء میں دیال سنگھ کالج لاہور میں شعبہ ریاضی کے صدر بنا دیے گئے۔ ملازمت کا آخری دور اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں گزارا اور 1980ء میں ریٹائر ہو گئے۔ اہم بات یہ ہے کہ ملازمت کے دوران حلقہ ارباب ذوق کی سرگرمیوں میں مظفر علی سید، ریاض احمد، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سجاد باقر رضوی، وحید قریشی اور سہیل احمد خان جیسے نقاد موجود تھے لیکن انجم رومانی نے اپنی شاعری پر کسی سے مضمون لکھنے کی فرمائش نہیں کی اور ان کی شاعری کی کتابیں بھی ریٹائرمنٹ کے بعد شائع ہوئیں۔ ان میں ''کوئے ملامت''، ''پس انداز''، ''دریا کے کنارے'' اور نعتوں کا مجموعہ ''ثنا اور طرح'' شامل ہیں۔ ان کا ایک اور اہم کام علامہ اقبال کے منتخب فارسی کلام کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ ان کے فرزند نسبتی (داماد) ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے ''کلیات انجم رومانی'' شائع کر کے انجم رومانی کی شاعری کا نقش مستحکم کرنے کی کاوش کی ہے۔

انتظار حسین نے انجم رومانی کو عمر خیام سے جا ملایا ہے جو شاعری بھی کرتے تھے اور علم ہندسہ میں بھی قدم رکھتے تھے لیکن قینچی کا سگریٹ پینے اور کھانسنے کے مشغلے صرف انجم رومانی میں پائے جاتے ہیں۔ عمر خیام ان سے محروم تھے۔ اس پر مستزاد حلقہ ارباب ذوق کی رکنیت تھی جسے انجم رومانی نے وفاداری اور استواری سے قائم رکھا۔ کئی برس حلقے کی ایگزیکٹو کمیٹی کے رکن رہے۔ کئی مرتبہ سیکرٹری منتخب ہوئے۔ حلقے کے ہفتہ وار جلسوں میں اپنی نظمیں اور غزلیں تنقید کے لیے شاید سب سے زیادہ تعداد میں پیش کیں اور ان پر کڑوی کسیلی تنقید صبر و تحمل سے سنی۔ عصری حالات ان کی غزل میں لہجے میں اضطراری تبدیلی پیدا کرتے تھے۔ ایوب خان کے مارشل لاء کے اوائل میں ان کے باطن سے جو آواز اٹھی وہ کچھ یوں تھی:

بیدار اہل قافلہ سونے کے دن گئے — ہشیار آگ میں ہے یہ جنگل گھرا ہوا

ہاں دیکھ کر ذرا کہ اندھیرا ہے رہ میں — ہاں تیز تر قدم کہ ہے بادل گھرا ہوا

اس دور کی بساط پہ ہر شاہ کو ہے مات — گھبرایئے نہ دیکھ کے پیدل گھرا ہوا

انجم رومانی کے باطن میں سے کبھی کبھی نظیر اکبر آبادی کی آواز بھی آنے لگتی تھی۔ اس عالم میں وہ روایتی تغزل کو اپنے قریب بھی نہ آنے دیتے اور گلے میں موٹے منکوں کی مالا ڈال کر چمٹا بجانے لگے:

تن ڈھانپ پہن کر ٹاٹ بھلے دن آئیں گے — دم سادھ زمانہ کاٹ، بھلے دن آئیں گے

مت بھری دکانیں دیکھ، ندیدے، چلتا بن — لے سودا، ہونٹ نہ چاٹ، بھلے دن آئیں گے

کر پار سنبھل کر چوک، زمانہ کاروں کا — بچ موڑ سے انجم جاٹ، بھلے دن آئیں گے

بہت کم لوگوں کو اب یاد ہوگا کہ انجم رومانی حلقہ ارباب ذوق کے پروگرام ''کچھ تو کہیے'' میں بھی سرگرم حصہ لیا کرتے تھے اور اپنے نقطہ نظر کو پورے تیقن سے پیش کرتے اور اہل محفل کو اپنے نقطے سے اتفاق کرنے پر مائل کرتے تھے۔ بلکہ انہوں نے چند تنقیدی مضامین بھی حلقے میں پیش کیے۔ ان کے چند مقالات کے عنوانات یہ ہیں ''عروض میں ترمیم کی ضرورت''، ''پاکستانی ادب کا سوال''، ''انگریزی بحریں اردو میں''، ''اردو املا میں ترمیم کی ضرورت'' وغیرہ۔

انجم رومانی 19 نومبر 1941ء کو حلقے کے رکن بنے تھے اور انہوں نے 1942ء میں اپنی دو غزلیں حلقے میں تنقید کے لیے پیش کی تھیں۔

انجم رومانی اپنی وضع کے منفرد ادیب تھے۔ بہت کم لوگوں نے انہیں قہقہہ لگاتے ہوئے دیکھا ہے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ علم ہندسہ میں کھوئے رہتے تھے۔ حلقے کے دوستوں کی رائے میں فکرِ سخن میں غرق رہتے تھے اور غزل کے ساتھ ہزل میں بھی رواں ہو جاتے تھے۔

صفدر میر بائیں بازو کے دانشور تھے۔ انجم رومانی کو ان کے رنگ ڈھنگ پسند نہیں تھے۔ ایک دن انہیں ٹی ہاؤس کی طرف آتا دیکھا تو طبیعت رواں ہوگئی اور یہ شعر بلند آواز میں پڑھا:

دیکھیو ، رکھنا نہ کوئی در کھلا
پھر رہا ہے شہر میں صفدر کھلا

فوجی صدر ایوب خان کے دور میں قدرت اللہ شہاب، شاہد احمد دہلوی اور جمیل الدین عالی نے پاکستان رائٹرز گلڈ قائم کیا تو کراچی میں پہلا کنونشن منعقد کیا گیا۔ اس کا دعوت نامہ لاہور پہنچا تو ادیبوں میں ہلچل مچ گئی اور ہر شخص دعوت نامہ حاصل کرنے کے لیے ادیب بننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت فضا میں مولانا صلاح الدین احمد کا یہ جملہ بھی گونج پیدا کر رہا تھا کہ ''ادیب پیغمبر ہیں اور پیغمبر گلڈ نہیں بناتے۔'' انجم رومانی کو نظیر اکبر آبادی کا ''آدمی نامہ'' یاد آیا اور انہوں نے طویل نظم ''رائٹر نامہ'' لکھ ڈالی۔ ایک مصرعہ یہ تھا:

''ٹائپ جو کر رہا ہے، سو ہے وہ بھی رائٹر''

انجم رومانی اپنے معاصر شعرا کے بارے میں جچی تلی رائے رکھتے تھے اور اسے برملا کہتے تھے۔ عمران نقوی کو ایک سوال پر کہ ''آپ کے نزدیک اس وقت کوئی ایسا شخص ہے جس کی شاعری پڑھ کر اسے شاعر کہا جا سکے؟'' انجم رومانی نے جواب دیا:

''منیر نیازی میں کچھ جان ہے۔ اسی طرح ظفر اقبال اور شہزاد احمد کے ہاں کچھ اچھے شعر بھی نکل آتے ہیں لیکن آج کوئی بڑا شاعر موجود نہیں۔

انفرادیت بہت کم ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آج تخلیق ہونے والی تمام
شاعری ایک ہی شاعر کی تخلیق کردہ ہے۔ چہرے پر خدوخال ہوتے ہیں جن
سے انفرادیت متعین ہوتی ہے۔ اس حوالے سے آج کے تمام شاعر سرکٹی
لاشیں معلوم ہوتے ہیں۔''

انجمن رومانی ترقی پسند مصنفین کے سخت مخالف تھے۔ اس کی دو وجوہات بتاتے تھے۔ اول نظریہ اور دوسرے اشتراکیت کا پروپیگنڈہ'' ان کی رائے میں ''فیض احمد فیض چند غزلوں پر زندہ ہیں'' اپنے اسلامی رنگ پر فخر کا اظہار کرتے تو کہتے:

''اسلامی رنگ میری غزل میں میرے اندر سے آتا ہے۔ میری شخصیت
میں موجود ہے۔''

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں انجم رومانی کی ایک نعت پیش کر کے مضمون ختم کر دیا جائے:

عجزِ بیاں ہے انجم کب لب مرے سلے ہیں ۔۔۔ آتے نہیں زباں پر دل کے معاملے ہیں
عرفان و آگہی کے جتنے بھی سلسلے ہیں ۔۔۔ پھوٹے ہیں سارے تجھ سے سب تجھ پہ آملے ہیں
دیدار کر رہے ہیں دیدار کرنے والے ۔۔۔ باہم اگرچہ حائل صدیوں کے فاصلے ہیں
ہیں اس قدر عطائیں، کیسے سمیٹ لائیں ۔۔۔ کوتاہ دامنی سے، ہم کو بہت گلے ہیں
آخر بھٹک کر، اے راہبروں کے رہبر ۔۔۔ آئیں گے تیرے در پر، یاں جتنے قافلے ہیں
پیاسوں کو اپنے خوں کے، کس نے گلے لگایا ۔۔۔ تیری ہی ہمتیں ہیں، تیرے ہی حوصلے ہیں
آساں نہیں کچھ انجم یاں دعویٰ غلامی ۔۔۔ کتنے ہی امتحاں ہیں، کتنے ہی مرحلے ہیں

ڈاکٹر انعام الحق کوثر

ڈاکٹر انعام الحق کوثر سے کسی ادبی تقریب میں ملاقات ہوتی تو میں پہلا سوال یہ کرتا کہ انہوں نے اپنے تعلیمی اور ادبی مشاغل کے لیے لاہور کو چھوڑ کر بلوچستان کو کیوں منتخب کیا تھا؟ ان کا ایک بیٹا کیمیکل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مستقل طور پر میرے پڑوس کے جہاں زیب بلاک میں مقیم ہو گیا تھا۔ دوسرا بیٹا ڈاکٹر تھا اور اس نے کینال ویو سوسائٹی میں اپنا گھر بنایا تھا۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر سادگی سے جواب دیتے کہ وہ اُردو زبان کے فروغ کے لیے بلوچستان گئے تھے اور کوئٹہ کے لوگوں نے ان پر اتنی محبت نچھاور کی کہ وہ اس خطے ہی میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ ان کا وطن مالوف متحدہ پنجاب کا مردم خیز خطہ جالندھر تھا جہاں وہ 11 اپریل 1931ء کو موضع کیناں کلاں میں پیدا ہوئے ان کے والد حکیم اور معلم تھے۔ بیٹے کو حکمت کی تعلیم اور جواں مردی کے کشتے بنانے کا فن سکھانے کی بجائے کتاب کے مطالعے اور ادب کی تعلیم کی طرف راغب کیا۔ چنانچہ انعام الحق کوثر پرائمری درجے کی جماعتوں میں ہی طلبہ کے سامنے تقریریں کرنے لگے۔ اپر مڈل کلاس میں پہنچے تو بچوں کے رسالوں کے لیے کہانیاں لکھنے لگے۔ ان کی ابتدائی کہانیاں رسالہ ''غنچہ'' میں چھپتی تھیں۔ میٹرک کا امتحان منگلا اسلامیہ ہائی سکول سے پاس کر لیا تو تھوڑے سے عرصے کے بعد ہی تشکیل پاکستان کا واقعہ ظہور میں آ گیا اور ان کا خاندان ہجرت کر کے لاہور پہنچ گیا۔ اس دوران میں ان کی کہانیاں ''ادارہ'' ''نوائے وقت'' کے ہفتہ روزہ رسالہ ''قندیل'' میں چھپتی تھیں جس کے ایڈیٹر محمد اختر تھے اور وہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ میں نے انعام الحق کوثر کی کچھ کہانیاں آغا شورش کاشمیری کے ہفتہ روزہ ''چٹان'' اور میاں محمد شفیع (م۔ش) کے ہفت روزہ رسالہ 'اقدام'' میں بھی پڑھی تھیں جسے محمد سرور جامعی مرتب کرتے تھے۔ اس دوران میں انہوں نے فارسی میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور

صحافت کا ڈپلومہ حاصل کرنے کے بعد درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔

ان کی پہلی تقرری گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں ہوئی۔ تھوڑے سے عرصے میں ہی ان کی تدریسی صلاحیتوں کا چرچا پورے بلوچستان میں پھیل گیا اور ان پر ترقی کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ وہ 1956ء میں لیکچرار کے عہدے پر متعین ہوئے تھے لیکن جلد ہی ان کو ڈگری کالج لورالائی کا پرنسپل بنا دیا گیا۔ پرنسپل کی حیثیت میں انہوں نے سبی اور مستونگ ڈگری کالجوں میں بھی خدمات انجام دیں۔ اس دوران میں ان کے ادب سے رابطے مضبوط سے مضبوط تر ہوتے گئے اور مطالعے میں وسعت پیدا ہوئی تو انہوں نے بلوچستان کے ادیبوں کو نہ صرف گہری نظر سے پڑھا بلکہ ان کے تاریخی تناظر کو بھی پیش نگاہ رکھا۔ انہوں نے 1963ء میں بابا افغانی شیرازی کی حیات اور ان کے فن پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ انہوں نے انگریزی زبان میں لکھا تھا۔ انہوں نے تعلیمی بورڈ کے چیئرمین کے عہدے پر خدمات انجام دینے کے علاوہ ڈائریکٹر تعلیمات، نصابیات و توسیع تعلیم کے عہدے پر بھی کام کیا اور اپنی تحقیق میں بلوچی ادب اور بلوچی ثقافت کو خصوصی اہمیت دی۔ ادب ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی زندگی کی اہم ترین سرگرمی تھی۔ سرکاری ملازمت اور فرائض منصبی سے جتنا وقت بچتا تھا وہ بلوچی ادب و ثقافت کی تحقیق و تنقید کے لیے صرف کرتے اور اس خطے میں نہ صرف اردو کے قدیم آثار دریافت کرتے بلکہ اپنے طلباء کو کلاسیکی اور جدید ادب کی تعلیم بھی دیتے اور ان کے ذوق کو سنوارنے میں گہری دلچسپی لیتے۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے بالعموم زبانی لحاظ سے طویل عرصے پر پھیلے ہوئے موضوعات پر کتابیں لکھیں اور ان میں جغرافیے کے ساتھ تاریخ کا سفر بھی طے کیا اور اپنی تصنیفات کو تذکرہ نگاری کا جدید رنگ دے دیا جس میں وقائع نگاری تنقید کے عمل سے بھی گزرتی ہے۔ اس کی بہترین مثال ان کی کتاب ''بلوچستان میں اردو'' ہے جسے حافظ محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اردو''۔ نصیر الدین ہاشمی کی کتاب ''دکن میں اردو''۔ فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کی کتاب

''سرحد میں اردو'' نبی بخش بلوچ کی ''سندھ میں اردو'' اور وفا راشدی کی ''بنگال میں اردو'' کے سلسلے کی کتاب شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اس کتاب میں بلوچستان میں اردو کی جڑوں کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے تو شعرا اور ادباء کا تذکرہ، مشاعروں اور مناظروں کا فروغ اور ادبی اداروں کے قیام وارتقاء کے سلسلے کو زمانی اعتبار سے اہمیت دی ہے اور اسے اردو ادب کی مستند تاریخ بنادیا جس میں بلوچستان کی تہذیب ان کی ہم سفر ہے۔ بلوچوں کے مزاج کا تجزیہ کیا تو لکھا:

> ''اہل بلوچستان کے لیے اردو زبان کی طرف مائل ہونا صرف اس زبان کے بنیادی مزاج ہی کے باعث آسان نہ تھا بلکہ خود اہل بلوچستان کا مزاج بھی انسانی تغیر کے لیے برصغیر میں سب سے زیادہ موزوں ہے۔''

ذولسانیت اس خطے کی خاصیت ہے اور ''کوئٹہ جو بلوچستان کا مرکز ہے لسانی تنوع کا ایک دلچسپ اور حیرت انگیز منظر پیش کرتا ہے۔'' ڈاکٹر انعام الحق کوثر رقم طراز ہیں:

> '' کوئٹہ میں براہوی، بلوچی اور پشتو کے علاوہ فارسی، اردو، سرائیکی اور پنجابی بولنے والے افراد بھی خاصی تعداد میں ملتے ہیں اور قریب قریب ہر فرد تین تین چار چار زبانیں بیک وقت آسانی اور روانی سے بول سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل بلوچستان کے لیے اردو کو اپنالینا قطعاً مشکل نہ تھا۔''

دوسری طرف ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ اردو کی تشکیل کی ابتدا بلوچستان سے ہوئی۔ انہوں نے لکھا ہے:

> ''لسانیات کے ماہرین کے مطابق اردو، بلوچی اور براہوتی فرہنگوں کا 25 فیصد سے 33 فیصد تک سرمایہ مشترک ہے۔ اس لسانی اشتراک کے باعث یہ نظریہ بھی پیش کیا جاچکا ہے کہ اردو کی تشکیل کی ابتداء بلوچستان سے ہوئی کیوں کہ

یہی بلوچستان ہے جو خلافت مشرقی کا صوبہ توران ہوتا تھا اور محمد بن قاسم کی مہم کے بعد ایک زمانے تک اس علاقے میں عربی، فارسی اور سندھی زبانیں بولنے والے لشکریوں کا میل ملاپ ہوتا رہا اور ان کی بول چال سے ایک نئی زبان تشکیل پانے لگی۔''

علاوہ ازیں ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے ''بلوچستان میں اردو'' میں متعدد ایسے مقامی شاعر بھی دریافت کیے ہیں جو اردو میں شاعری کرتے تھے۔ان میں اولیت ملا محمد حسن براہوئی کو حاصل ہے جن کا اردو کلیات 1847ء میں تکمیل پذیر ہوا۔اس وقت بلوچستان میں کسی ایسے مدرسے کا نام ونشان بھی نہیں ملتا جس میں اردو پڑھائی جاتی ہو۔ڈاکٹر صاحب نے منکشف کیا ہے کہ ملا محمد حسن نے میرزا محمد رفیع کی غزلیات پر تضمینات بھی لکھی تھیں اور ان کے کلام پر ولی دکنی کے اثرات بھی ملتے ہیں اور اب بلوچستان میں پہلے اردو شاعر کی دریافت ڈاکٹر انعام الحق کوثر کا کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ملا محمد حسن کا اردو دیوان بھی انہوں نے ہی مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی مشہور کتابوں میں ''بلوچستان میں فارسی شاعری''۔''مقدمہ'' جوہر معظم'' دیوان ناطق مکرانی''۔''ارمغان کوثر''۔''صوفیائے بلوچستان''۔''بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں کا تقابلی مطالعہ'' اور ''تحریک پاکستان میں بلوچستان کا کردار'' وغیرہ شامل ہیں۔بچوں کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے انہوں نے ''بچوں کی تربیت میں کتاب کا حصہ''۔''بچوں کے لٹریچر کی تیاری میں نفسیات کا کردار'' اور ''اسلام اور بچے کی تربیت ونگہداشت'' وغیرہ کتابیں لکھیں۔ڈاکٹر انعام الحق کوثر دینی مزاج کے انسان تھے۔اسلام کی عالمگیریت پر یقین کامل رکھتے تھے۔انہوں نے اسلامی موضوعات پر قلم اٹھایا تو ''سیرت طیبہ سے راہنمائی'' اور ''سرور کائنات بحیثیت امن واخوت کے داعی جیسی کتابیں لکھیں۔غالبیات پر ''مرزا غالب قومی وعالمی تناظر میں'' اور اقبالیات پر متفرق مضامین کا ایک گراں قدر مجموعہ اور ''اقبالیات کے چند گوشے'' شائع کیں۔ان کی کتابوں کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے اور ان میں سے بیشتر تحقیق وتنقید میں

حوالے کی کتابیں شمار ہوتی ہیں۔ ان کو اپنی کتابوں پر پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ مل چکا ہے۔
1997ء میں انہیں صدر پاکستان کا تمغہ حسن کارکردگی Pirde of performance award عطا کیا گیا۔ اردو، فارسی، انگریزی، بلوچی اور براہوئی سے کئی کتابوں کے تراجم اردو میں کیے بالفاظ دیگر ان کی مساعی سے بلوچی ادب کی کھڑکی اردو ادب کی طرف کھل گئی تھی۔

انعام الحق کوثر 1956ء میں کوئٹہ آئے تو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی ادبی روایت بھی اپنے ساتھ لائے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ بلوچستان میں اردو کو مختلف علاقوں میں رابطے کی زبان کی حیثیت میں عوام نے ماضی بعید سے قبول کر رکھا اور آزادی کے بعد بلوچستان کو یہ اعزاز بھی حاصل ہوا کہ اردو کو عدالتوں میں فیصلے لکھنے کے لیے بھی سرکاری طور پر اجازت دی گئی لیکن اردو زبان وادب کو فروغ بیشتر ان لوگوں نے دیا جو ملازمت کے سلسلے میں کوئٹہ آئے اور ادبی انجمنوں کی تشکیل وتعمیر میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اپنی تحقیقی کتاب ''بلوچستان میں اردو'' میں ایک طویل باب ''بلوچستان کی ادبی انجمنیں'' اور اردو مشاعرے کے عنوان سے مختص کیا ہے اور اس حقیقت کو آشکار کیا ہے۔

> ''اصل شعر گوئی تو حقیقتاً وہی خصوصیت ہے لیکن شعر فہمی اور شعر خوانی ہر ایک کی دسترس میں ہے۔ چنانچہ ساسانیوں سے مغلوں تک ایشیا کے اس حصے یعنی پاکستان و ہندوستان میں شعر فہمی، انفرادی، درباری اور سماجی زندگی اور عظمت کا ایک لازمہ تھی۔ یہ ایسا فن تھا جس سے بادشاہ اور عوام مساوی طور پر لطف اندوز ہوتے رہے۔ رسم مشاعرہ اسی ذوق وشوق کا ایک مظہر تھی جس کے پیش نظر یہ تھا کہ تھوڑے وقت میں عوام کو زیادہ سے زیادہ شاعروں سے متعارف کرادیا جائے۔ اگرچہ بعد میں ''آہ'' اور ''واہ'' کے غلبے کے باعث مشاعرہ ایک اجتماعی ذوق کی تنظیم کرنے کی بجائے ایک تماشا اور ایک تفریح بن کر رہ گیا (اور غالباً اسی وجہ سے اب وہ آمادۂ زوال ہے) پھر بھی مشاعرے سے شعر و شاعری کی اشاعت کا زبردست کام لیا جاتا رہا۔''

ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی تحقیق کے مطابق بلوچستان میں مشاعروں کا آغاز لورالائی سے 1911ء میں ہوا۔ وقار انبالوی کی رائے میں بلوچستان میں اردو شاعری کے پہلے علمبردار سردار محمد یوسف پوپلوئی اور لالہ فتح چند نسیم تھے اور یہ دونوں لورالائی کے مشاعرے میں بھی شرکت فرماتے تھے۔ نشتر جالندھری 1915ء میں میٹرک کا امتحان پاس کر کے کوئٹہ میں بارک ماسٹری کے دفتر میں ملازم ہوگئے۔ انہوں نے کوئٹہ میں شاعری کے فروغ کے لیے 1915ء میں ''بزم سخن'' کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس میں پنجاب اور ہندوستان کے گوشے گوشے سے نامور شعراء بلائے جاتے اور شعر وسخن کا بازار گرم کیا جاتا۔ 1928ء میں جو مشاعرہ منعقد ہوا اس کی صدارت سر شیخ عبدالقادر نے کی اور 1929ء کے مشاعرے کے صدر حفیظ جالندھری تھے۔ ''بلوچستان میں اردو'' کا یہ باب واضح کرتا ہے کہ متحدہ ہندوستان اور بعد پاکستان کے بڑے شہروں کے ممتاز شعراء نے کوئٹے کے مشاعروں میں شرکت کی، اور انعام الحق کوثر کوئٹہ پہنچے تو یہ روایت مستحکم ہو چکی تھی اور ادب وشعر کا ذوق عوام میں فروغ پانے لگا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ 1950ء میں مجھے محکمہ آبپاشی میانوالی کے تعمیراتی کاموں کے سلسلے میں سرکاری بھٹے چلانے کے لیے کوئلہ لانے کو بھیجا گیا۔ اتفاق سے ریل گاڑی کے جس ڈبے میں، میں سوار تھا، اسی میں اردو کے معروف شاعر ماہر القادری اور تابش دہلوی بھی سوار تھے۔ میں نے ان کے مشاعرے میں بھی حاضری دی تھی۔ بلاشبہ پنڈال میں ہزاروں اہل ذوق موجود تھے جو اچھے شعر پر کھل کر داد دیتے نظر آتے تھے۔ اس مشاعرے میں ماہر صاحب کی طویل بحر کی نظم نے سماں باندھ دیا تھا۔

انعام الحق کوثر نے جو ادبی انجمن قائم کی اسے دانش گاہ پنجاب لاہور کے شعبہ صحافت کے پریس کلب کی شاخ قرار دیا اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد قائم نہیں کی۔ باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ کوئٹہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین، حلقہ ارباب ذوق رائٹرز گلڈ اور انجمن ترقی اردو وغیرہ کے قیام اور زوال کے حالات سے شناسا تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک بڑے شجرے سے پیوستہ رہنے کو ترجیح دی۔

بلوچستان کی ثقافتی زندگی میں 1978ء کا سال اس لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ اس برس محترمہ ثاقبہ رحیم الدین نے ڈاکٹر انعام الحق کوثر، پروفیسر مجتبیٰ حسین، خلیل صدیقی اور جناب زمرد حسین کی معاونت سے ''قلم قبیلہ'' کی بنیاد رکھی۔ ماضی قریب میں چھوٹے چھوٹے ادبی ادارے بلاشبہ معرض وجود میں آتے رہے ہیں اور جگنوؤں کی طرح چمک دکھا کر غائب ہوجاتے رہے۔ لیکن ''قلم قبیلہ'' کو محترمہ ثاقبہ رحیم الدین کی فعال اور ہمہ وقت متحرک شخصیت نے تاحیات سرپرستی کا شرف عطا کیا گیا اور انہوں نے اپنے اس عہدے کے فرائض کو بے مثل انداز میں انجام دیا۔ اہم بات یہ کہ ان کی مجلس عاملہ میں سب فیصلے اتفاق رائے سے ہوتے اور ان پر عملدر آمد استقلال سے کیا جاتا۔ اس فعال ادبی تنظیم نے نجی شعبے میں کام کرنے والے ادبی اداروں میں ممتاز مقام حاصل کرلیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ محترمہ ثاقبہ رحیم الدین کو خاندانی ضرورتوں کے تحت اسلام آباد منتقل ہونا پڑا لیکن ان کا دل ''قلم قبیلہ'' کی سرگرمیوں کے ساتھ ہی دھڑک رہا ہے اور ان کے معاونین نے ان کے ادبی منصوبوں میں ان کے ساتھ پوری طرح تعاون کیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ کوئٹہ کے ایک سیمینار میں محترمہ ثاقبہ رحیم الدین نے ڈاکٹر انعام الحق کوثر کو اپنا دایاں بازو قرار دیا تھا اور ان کی ادبی فتوحات اور قلم قبیلہ کے منصوبوں میں کامیابی کی بے حد تعریف کی تھی۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے کوئٹہ کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ لیکن بلوچستان میں قومی سیاست نے ایسے پلٹے کھائے کہ ڈاکٹر کوثر صاحب کو کوئٹہ چھوڑنا پڑا اور وہ لاہور آگئے۔ یہاں انہوں نے اپنی زندگی قریباً گوشہ نامی میں بسر کی۔ بڑھاپے کی علالتوں نے انہیں معذور کر دیا تھا۔ ملتے تو کہتے ''میں اپنے وطن میں اجنبی ہوں''۔ آخر موت نے بازی جیت لی، وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔

اے حمید

سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر جیسے افسانہ نگاروں کے فنی عروج کے دور میں اے حمید ایک ایسا افسانہ نگار تھا جو اپنے ابتدائی افسانے ''منزل منزل'' کی اشاعت پر شہرت کے نصف النہار پر پہنچ گیا تھا۔ اس کا پہلا افسانہ ''تعریف اس خدا کی'' جو اس دور کے ممتاز ادبی رسالے ''ادب لطیف ''میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے کی تحسین ''ادب لطیف'' کے مدیر عارف عبدالمتین کے سوا کسی نے نہیں کی۔ عارف صاحب کو یہ افسانہ اتنا پسند آیا کہ انہوں نے اے حمید سے جو امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آچکا تھا اور اکثر لارنس باغ میں املتاس کے درختوں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے پایا جاتا تھا، ایک اور افسانہ مانگ لیا۔ اے حمید امرتسر سے آنے والے ظہیر کاشمیری، سیف الدین سیف، احمد مشتاق، عارف عبدالمتین، شہزاد احمد، احمد راہی اور ضبط قریشی جیسے ادیبوں میں ادب کے حوالے سے بالکل غیر معروف ادیب تھا لیکن امرتسر کے کمپنی باغ میں پراسرار گھنے درخت اور پھولوں کے تختے اس کے دل میں ایک رومانی دنیا اپنی تمام تر خوشبوؤں کے ساتھ آباد کر چکے تھے۔ اس کے والد خلیفہ عبدالعزیز نے اسے پہلوان بنا کر کیکر سنگھ سے کشتی لڑانے کا ارادہ کیا تو اے حمید گھر سے بھاگ کھڑا ہوا، کھٹ کھٹ کرتی ریل گاڑی پکڑی اور کلکتہ جا پہنچا۔ ایک صبح دریچے سے چوکھٹ پر بیٹھی ایک سانولی سلونی بنگالی لڑکی کو کانسی کی گڑویاں دھوتے دیکھا تو اے حمید سٹی بھول گیا۔ یہ اس کے یک طرفہ رومانوی عشق کا پہلا تجربہ تھا۔ انہیں دنوں اس نے پری چہرہ نسیم بانو کی فلم ''میں ہاری'' دیکھی تو بنگالی لڑکی کے سراپا پر نسیم بانو سپر امپوز (Super Impose) ہوگئی۔ اور وہ حقیقی نسیم بانو کی تلاش میں بمبئی پہنچ گیا۔ بمبئی میں نسیم بانو تک پہنچنے سے پہلے اسے ایک مندر میں پوجا کے دیئے اٹھائے ایک دیوداسی نظر آ گئی اور اس نے اے حمید کا دل لوٹ لیا۔ پہلی نظر کا یہ عشق بھی یکطرفہ تھا۔ کیوں کہ ایک روشن دیئے

کے بعد دیوداسی نہ جانے کہاں غائب ہوگئی اور اے حمید گزر اوقات کے لیے ایک حکیم صاحب کی دکان پر آہنی ہاون میں دوائیں ڈال کر لوہے کے دستے سے کوٹنے لگا۔ روزی روٹی کے اس چکر میں بھی اسے ایک لڑکی دکان کے سامنے کے ادھ کھلے دریچے میں نظر آتی اور اس کے دل کو برماجاتی لیکن اے حمید کا یہ عشق بھی یکطرفہ ہی تھا۔ گھوم پھر کر اور گوناں گوں تجربات سمیٹ کر اے حمید واپس آیا تو اس کے والد خلیفہ عبدالعزیز کے دل میں یہ خیال موجود تھا کہ اے حمید نے پہلوان کیکر سنگھ کو پچھاڑنا ہے اور اس سے پہلوانی کا گرز چھین کر مسلمانوں کا سر بلند کرنا ہے۔ اے حمید گھر سے پھر بھاگ کھڑا ہوا اور اس دفعہ وہ کلکتہ اور ڈھاکہ اور چاٹ گام سے بھی آگے نکل کر رنگون پہنچ گیا۔۔۔۔۔۔افسانہ نگار انتظار حسین نے بہت عرصہ کے بعد امرتسر کے اس ''ڈان ژوان'' کی یہ داستان سنی تو پوچھا:

''اے عزیز، پھر کیا ہوا؟''

اے حمید نے اسے بتایا:

> ''رنگون میں ایک بدھ مندر تھا، برمی لڑکیاں کنول کے پھول لے کر آتیں اور بدھ کی مورتی پر چڑھاتیں، ان میں سے ایک لڑکی بہت اچھی تھی، میں روز اسے دیکھتا اور گھر آکر ڈائری لکھتا۔ پھر رنگون پر بم گرا۔ وہ لڑکی نظروں سے اوجھل ہوگئی اور میں نے اپنی ڈائری ایراوتی ندی میں پھینک دی۔ میری امانت اس کے پاس ہے۔ میں مرنے کے بعد وہاں جاؤں گا اور ایراوتی سے اپنی ڈائری لوں گا۔''

اے حمید رنگون سے واپس آیا تو ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا اور امرتسر میں سکھوں نے آزادی سے پہلے ہی مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنی شروع کر دی تھی۔ امرتسر جل رہا تھا۔ ظلم اور بربریت کے شرمناک مناظر اے حمید نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور یوں اس کے باطن سے ایک محبِّ وطن افسانہ نگار ابھرا جو ہر واقعے کو رومانی نظر سے دیکھتا تھا اور خیر کا زاویہ تلاش کرنے

کی کوشش کرتا تھا۔ اس کے تجربات امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آنے والے دوسرے نامور ادیبوں کے تجربات سے مختلف تھے اور ان کا مدار، بمبئی، کلکتہ اور رنگون تک پھیلا ہوا تھا۔ تاہم ان مہاجر ادیبوں نے لاہور میں ''امرتسر سکول آف تھاٹ'' کی بنیاد رکھی تو اے حمید کا رومانوی مزاج اسے ادیبوں کے اس حلقے میں لے گیا جو امرتسر کے حوالے سے اس کے شناساؤں پر مشتمل تھا۔ اس عرصے میں اندرون شہر کی ایک لڑکی اس کے دل میں سما گئی تھی اور اب کے آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔ اے حمید نے اپنے اس عشق کی داستان افسانہ ''منزل منزل'' میں لکھی لیکن وہ اپنی محبوبہ کی اس التجا کو نہیں بھولا تھا۔

''حمید صاحب میری محبت کی کہانی مت لکھنا۔ میں بدنام ہو جاؤں گی۔''

چنانچہ اے حمید نے اپنی ہیروئن کے حقیقی تشخص کی پوری پردہ پوشی کی اور اس کو ساجدہ کے فرضی نام سے متعارف کرایا۔

''ادب لطیف'' کے مدیر عارف عبدالمتین نے یہ افسانہ ''منزل منزل'' کے عنوان سے شائع کیا تو اے حمید جو اپنے پہلے افسانے ''تعریف اس خدا کی'' ۔۔۔ کی اشاعت پر غیر معروف تھا اب افسانہ نگاروں کی صف اول میں شامل ہو چکا تھا اور ''ساجدہ'' کا کردار بھی شہرت عام حاصل کر چکا تھا۔ اس دور میں اے حمید نے ''حسن اور روٹی'' ۔۔۔ ''گولڈ فلیک اور بیڑی'' ۔۔۔ ''یروشلم یروشلم'' ۔۔۔ ''ایک لڑکی، کئی لڑکیاں'' اور ''ایک رات'' جیسے افسانے لکھے جن میں فرقہ وارانہ فسادات کی بربریت، آزادی سے پہلے کی سیاست آرائی، انسانی سکون، آسودگی اور مسرتوں کی گمشدگی کے آثار بھی دیکھے جا سکتے ہیں اور اے حمید کی رومانوی نثر نے حقیقت کے اس انداز کو بھی قائم رکھا ہے جو اس دور میں ترقی پسند افسانہ نگاروں کو زیادہ مرغوب تھا۔ اس دور میں ہی کہا جانے لگا کہ اے حمید کرشن چندر کی انگلی پکڑ کر اُردو افسانے میں آیا ہے لیکن جب خود اے حمید سے دریافت کیا گیا تو اس نے کرشن چندر سے اپنے تعلق خاطر سے انکار نہیں کیا لیکن سب سے بڑھ کر رفیق حسین کا نام لیا اور کہا:

''میں پاگل لکھنے والا ہوں اور پاگلوں کو پسند کرتا ہوں۔ میں نے رفیق حسین سے بڑا پاگل افسانے میں کسی اور کو نہیں پایا۔اس نے مجھے مار ڈالا ہے۔''

میں نے ''آئینہ حیرت'' کے مصنف رفیق حسین کے افسانے شاہد احمد دہلوی کے رسالہ ''ساقی'' میں پڑھے تھے، رفیق حسین جانوروں پر افسانے لکھتا تھا اور ان کی نفسیات سے انسانی قدروں کو اس طرح اجاگر کرتا کہ جانور انسان سے بہتر مخلوق نظر آنے لگتے۔ اے حمید گوشت پوست کے انسانوں کا ترجمان تھا اور اس کا بنیادی موضوع محبت تھی جس کی تکمیل میں سماج ہر جگہ مزاحمت پر آمادہ نظر آتا ہے۔ وہ درختوں، پرندوں، پھولوں، سریلی آوازوں اور حسین چہروں کا افسانہ نگار تھا۔جنگل اور گلشن اسے اپنی طرف بلاتے تو وہ سب کچھ بھول کر ادھر لپکتا چلا جاتا۔ اس جمالیاتی فضا نے ہی اس کے قلم کو مرصع رومانی نثر لکھنے کی تربیت دی اور وہ رومانی ادب کا نمائندہ افسانہ نگار تسلیم کیا جانے لگا۔۔۔ اکثر اوقات وہ منظر کے بیان میں اس قدر گم ہو جاتا کہ کہانی پیچھے رہ جاتی لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ قاری اے حمید کی رومانویت میں دلچسپی لیتا تھا۔۔۔اس کی انگلی نہیں چھوڑتا تھا اور حد یہ ہے کہ زندگی کی سفا کی میں جو منظر کسی کو اپنی طرف متوجہ نہ کرتا، وہی منظر اے حمید پر والہانہ کیفیت طاری کر دیتا اور اس کا قلم اس منظر کو بہارِ بے خزاں کی حیثیت دے ڈالتا۔ اس دور کے ممتاز افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے تو اسے ایک بھری مجلس میں ڈانٹ دیا اور کہا ''اے حمید بکواس ہے۔ وہ کھمبے کو دیکھ کر بھی رومینٹک ہو جاتا ہے۔'' اے حمید اور رفیق حسین کے فن میں کوئی قدرِ مشترک نظر نہیں آتی۔ہاں یہ خوبی ان میں موجود ہے کہ دونوں ''کہانی'' کو اپنی شخصیت کا جزو بنا لیتے تھے۔ کہانی ان پر الہامی صورت میں اترنے لگتی تھی اور دونوں فطری کہانی نگار تھے۔فن کی یہ بلندی بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوئی ہے کہ واقعہ خود ادیب کو پاگل کر دے اور وہ اپنا ذہنی توازن قائم رکھنے کے لیے اس واقعے پر افسانہ تعمیر کر ڈالے۔

اے حمید امرتسر سے لاہور وارد ہوا تو وہ ایم اے او ہائی سکول سے میٹرک کر چکا

تھا۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں فیض احمد فیض بھی اسی سکول میں پڑھاتے تھے اور اے حمید کو بھی فیض صاحب سے سکول کا سبق لینے کا شرف حاصل ہوا۔ اس نے لاہور میں ادھوری تعلیم پوری کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔ ایک روایت کے مطابق اس نے پہلے ادیب عالم اور ادیب فاضل کے امتحانات پاس کیے جن کی تیاری دلی دروازے کے باہر ایک درس گاہ میں آقا بیدار بخت کراتے تھے اور پھر انگریزی کا امتحان دے کر ایف اے اور بی اے کی ڈگری مل جاتی تھی۔ کچھ دوستوں نے بتایا کہ اے حمید نے Via Bhatinda بی۔ اے کر لیا تھا لیکن بعض کا خیال ہے کہ اُس کے رومانوی مزاج نے اس الجھنوں بھرے ''شارٹ کٹ'' کو بھی قبول نہ کیا۔ وہ تمیز الرحمان تھا۔ کہانی کہنے کا فن اسے مبدائے فیاض سے ملا تھا۔ چنانچہ اس کے ابتدائی افسانوں۔۔۔ ''منزل منزل''۔۔۔ ''حسن اور روٹی'' اور ''گولڈ فلیک اور بیڑی'' کی پذیرائی ہوئی تو اس نے یونیورسٹی کی تعلیم کو غیر ضروری سمجھا اور 1952ء میں پاکستان ریڈیو لاہور سے بطور سٹاف آرٹسٹ منسلک ہو گیا۔ جہاں اس وقت اخلاق احمد دہلوی، مصطفیٰ علی ہمدانی، اشفاق احمد، انصار ناصری، موہنی حمید، ابوالحسن نغمی، میرزا ادیب، حمید نسیم اور شوکت تھانوی جیسے ممتاز لوگ موجود تھے۔ اے حمید اس گلشن میں اپنی انوکھی خوشبو لے کر آیا اور اسے اپنی جگہ بنانے میں دیر نہ لگی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ریڈیو پاکستان لاہور میں جب ''ٹریڈ یونین ازم'' کی لہر چلی تو یار لوگوں نے اے حمید کو ''سٹاف آرٹسٹ یونین'' کا صدر چن لیا۔ اس دوران ہی اے حمید لاہور کے اخبارات میں ''کالم'' بھی لکھنے لگا۔ شاید اسے یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ اس کا رزق حیات قلم اور قرطاس کے ساتھ وابستہ ہے۔ چنانچہ اس نے ٹمپل روڈ لاہور سے نکلنے والے اخبار ''ترجمان'' میں ملازمت بھی اختیار کر لی جہاں وہ ''نیوز ایڈیٹر'' کی حیثیت میں انگریزی خبروں کا ترجمہ اردو میں کرتا تھا۔ ایک دن ''ترجمان'' کے دفتر میں اس کا دوست اکمل علیمی آ گیا تو اے حمید خوشی سے کھل اٹھا۔ علیمی صاحب کو اپنی کرسی پر بٹھایا۔ اپنے کاغذ سمیٹے اور کہا:

''اچھا ہوا، تم آ گئے ہو۔ خبروں کا ترجمہ شروع کرو، میں ابھی آ جاتا ہوں۔''

اے حمید رات گئے تک واپس نہ آیا تو ہیڈ کاتب نے کہا ''علیمی صاحب ،لگتا ہے حمید صاحب واپس نہیں آئیں گے ، آخری کاپی پریس میں جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ آپ ہی کاپی جوڑیئے'' ۔۔۔۔ چند روز کے بعد اکمل علیمی کو اے حمید ٹی ہاؤس میں مل گیا۔ علیمی صاحب نے پوچھا:

''مجھے اخبار میں پھنسا کر خود کہاں روپوش ہو گئے تھے؟''

اے حمید نے اس کا جواب نہ دیا بلکہ مشورہ دیا ''جب تک باتنخواہ نوکری نہیں ملتی وہاں لگے رہو'' بھری مجلس سے اچانک غائب ہو جانے کا ایک واقعہ مجھے بھی یاد آیا ہے۔ ممتاز افسانہ نگار غلام الثقلین نقوی کے افسانوں کی پہلی کتاب ''شفق کے سائے'' چھپی تو سید قاسم محمود نے اس کتاب کی تعارفی تقریب کا اہتمام ''نیشنل بک سنٹر'' لاہور میں کیا جس کا دفتر پاکستان رائٹرز گلڈ کی لاہور شاخ میں منٹگمری روڈ پر واقع تھا۔ اس جلسے میں شرکت کے لیے وزیر آغا خاص طور پر سرگودھا سے تشریف لائے تھے اور میں بھی ان کے ہمرکاب تھا۔ جلسے کی صدارت سید وقار عظیم نے کرنی تھی لیکن وہ بوجوہ وقت پر نہ پہنچ سکے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے قاسم محمود کو مشورہ دیا کہ وقار عظیم صاحب کی عدم موجودگی کی وجہ سے کرسی صدارت اے حمید۔۔۔ کو پیش کر دیں جو اگلی صف میں رحمان مذنب کے ساتھ بیٹھا تھا۔ قاسم محمود نے اے حمید کو کرسی صدارت پر بٹھایا اور تقریب کا آغاز کر دیا۔ ابھی دو یا تین مضامین ہی پڑھے گئے تھے کہ اے حمید اپنی نشست سے اٹھ کر بغلی دروازے کی طرف چلا گیا۔۔۔ سب نے سمجھا کہ ''ٹائیلٹ'' میں گیا ہے ابھی واپس آ جائے گا، لیکن دیر تک واپس نہ آیا اور ٹائیلٹ کا دروازہ بھی کھلا دیکھا تو قاسم محمود سمجھ گئے کہ اے حمید اب واپس نہیں آئے گا تو اجلاس کی کارروائی جاری کر دی۔ لیکن یہ عقدہ کبھی نہیں کھلا کہ اے حمید صدارت کی کرسی سے اٹھ کر کیوں چلا گیا تھا؟

میرا خیال ہے کہ اے حمید اپنے ذاتی احساسات اور اعصاب کے ردعمل کے ادیب تھے۔ خارج سے کوئی اقدام اس کے مزاج کے خلاف وارد ہوتا تو اپنے پاسبان عقل کی بات نہ

سنتا اور دل کے فیصلے پر عمل کرتا۔۔۔اکمل علیمی صاحب امریکہ گئے تو اے حمید کے لیے بھی ’’وائس آف امریکہ‘‘ سے وابستگی کا انتظام کیا۔ کنٹریکٹ دو سال کا تھا اور اے حمید نے اکمل علیمی کے گھر کے ایک پر سیب اور آلوچے کے درختوں کی شاخوں کو جھکا ہوا دیکھا تو اس کے رومانوی مزاج کو بے پایاں مسرت محسوس ہوئی۔ لیکن وہ چند دنوں کے بعد ہی اداس ہو گیا۔ اسے لاہور یاد آنے لگا تھا، اس نے ریحانہ سے محبت کی شادی کی تھی۔ امریکہ کی تنہائی میں اسے ریحانہ کی یاد ستانے لگی۔ ریحانہ اور بچے امریکہ پہنچ گئے اور کرائے کے ایک اپارٹمنٹ میں رہنے لگے لیکن ایک راسخ معمول کے مطابق اے حمید کو ہر روز گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر جانا اور آٹھ گھنٹے کولہو میں جتے ہوئے بیل کی طرح کام کرنا پسند نہیں تھا۔ چنانچہ کنٹریکٹ کی میعاد ختم ہوتے ہی اے حمید واپس لاہور آ گیا۔ اس دور کا ایک دلچسپ اور حیرت انگیز واقعہ اکمل علیمی نے بیان کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ’’پروفیسر گوپی چند نارنگ، واشنگٹن آئے تو انہوں نے مجھے فون کیا۔ وہ اے حمید سے ملنا چاہتے تھے۔ میں نے اے حمید کو بتایا تو وہ بیزاری سے بولے ’’دفع کرو، کون میری لینڈ (Mary Land) جائے گا۔ تم گھر آ جاؤ۔ حفیظہ (اے حمید اپنی بیگم ریحانہ کو حفیظہ کہہ کر بلاتے تھے) چائے بنائیں گی اور ہم دونوں بھائی مل کر پئیں گے۔‘‘

اب ریحانہ کا ذکر آیا ہے تو یہ لکھنا ضروری ہے کہ وہ کشمیری نژاد نہیں تھی۔ اے حمید کا خاندان اس شادی پر راضی نہیں تھا۔ لیکن اے حمید کے اندر کا رومانی انسان اپنے فیصلے خود کرنے کا عادی تھا۔ اس نے اپنے خاندان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب سے بات کی تو انہوں نے شفقت سے کہا:

> ’’فکر کی کیا بات ہے؟ میں پیغام لے کر لڑکی والوں کے گھر جاتا ہوں۔‘‘

خوشی کی بات یہ ہے کہ قاسمی صاحب کا پیغام قبول کر لیا گیا اور شادی بھی ہو گئی، اے حمید نے لکھا ہے:

''ایک طرح سے قاسمی صاحب نے بڑی بھاری ذمہ داری اپنے سر لی تھی کیونکہ میری آوارہ گردیاں اور غیر ذمہ داریاں ان سب پر سب سے زیادہ عیاں تھیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ سرخرو ہیں اور ان شاء اللہ ہمیشہ سرخرو رہیں گے۔''

لاہور میں امتیاز اور حجاب، اشفاق اور بانو قدسیہ اور صابر اور فرخندہ لودھی کی طرح یہ مثالی جوڑا تھا۔

اے حمید کا شمار اردو کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے آزاد زندگی بسر کی سرکاری نوکری کے چنگل میں کبھی نہیں پھنسے اور اپنا رزق قلم سے پیدا کیا۔ وہ بنیادی طور پر مجلسی انسان تھا لیکن قلم کی مصروفیت نے اے حمید کو معاشرے سے یکسر کاٹ دیا تھا۔ صبح اٹھتے ہی گھر کے سامنے باغیچے میں درختوں اور پرندوں کے ساتھ سرگوشیاں کرتا اور پھر اپنی لائبریری میں تصنیف و تالیف میں مصروف ہو جاتا۔ دوستوں، ناشروں اور شیدائیوں کے ٹیلی فون آتے لیکن انہیں ریحانہ سنتیں اور خود ہی جواب دے دیتیں، کسی تقریب میں شرکت کی دعوت آتی تو ٹال دیتیں۔ اس تحریری باقاعدگی کا یہی نتیجہ ہے کہ اے حمید نے اپنی زندگی میں اپنے معاصر ادیبوں سے زیادہ لکھا ان کے افسانوں، ناولوں، یادوں اور خاکوں پر کتابوں میں۔۔۔'' منزل منزل''۔۔۔ کچھ یادیں کچھ آنسو''۔۔۔'' ڈربے، مٹی کی مونالیزا، خزاں کا گشت،۔۔۔'' دیکھو شہر لاہور''۔۔۔'' بہار کا آخری پھول''۔۔۔'' پیپل والی گلی'' اور'' سمندر جاگتا ہے'' بہت مشہور ہیں اور تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ اے حمید نسبتیں قائم رکھنے والا انسان تھا۔ اس کا واسطہ مقبول اکیڈمی کے ملک مقبول احمد سے ہوا تو یہ تعلق خون کے رشتوں سے زیادہ مضبوط ہو گیا۔ اے حمید کی تخلیقات چھاپنے کے لیے اشاعتی ادارے کے مالک دس بستہ کھڑے رہتے تھے لیکن اس نے مقبول اکیڈمی کو ہمیشہ فوقیت دی۔ ایک اندازے کے مطابق اے حمید کی ایک سو کے لگ بھگ کتابیں مقبول اکیڈمی نے شائع کیں۔ یہاں اے حمید کی اس خوبی کا اعتراف بھی ضروری ہے

کہ اس نے سلسلہ در سلسلہ ناول لکھنے کی روایت کو بھی مضبوط کیا۔ چنانچہ اس کا ایک ناول جہاں ختم ہوتا وہیں سے دوسرا ناول شروع ہو جاتا۔ اس کا ناول ''بھارت کے فرعون'' نو حصوں میں ''کشمیر کے شاہین'' تین جلدوں میں، ''وطن کے سرفروش'' پانچ جلدوں میں، اور ''کمانڈو'' سات جلدوں پر مشتمل ہیں۔ روزنامہ ''نوائے وقت'' کے سنڈے ایڈیشن میں گزشتہ کئی برسوں سے ان کا کالم ''بارش، خوشبو اور سماوار'' چھپ رہا تھا جو پوری اردو دنیا میں دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ اے حمید کو ان کے ایک ترقی پسند دوست نے ''نوائے وقت'' چھوڑ کر ان کے اپنے اخبار میں چار گنا معاوضے پر یہ کالم لکھنے کی تجویز پیش کی لیکن اے حمید نے صاف انکار کر دیا کہ وہ مجید نظامی صاحب کا ساتھ زیادہ پیسے کے لالچ میں چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ ان پر جب تک موت کی بے ہوشی طاری نہیں ہوئی وہ یہ کالم باقاعدگی سے ''نوائے وقت'' میں ہی لکھتا رہا۔۔۔اہم بات یہ ہے کہ جن بچوں نے اے حمید کو اپنے بچپن میں پڑھنا شروع کیا تھا وہ اب خود بوڑھے ہو چکے ہیں لیکن اے حمید کا قلم زندگی کے آخری دور تک تازہ دم اور رومانویت کے اعتبار سے روح پرور رہا۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ اس کے فن پر ان کی زندگی میں ڈھنگ کا ایک مقالہ یا مضمون بھی نہیں لکھا گیا اور انوار احمد نے اپنی کتاب ''اردو فسانہ۔۔۔ایک صدی کا قصہ'' میں جو مضمون شامل کیا ہے وہ صرف تین صفحات (قریباً 70 سطریں۔۔۔400 الفاظ) پر مشتمل ہے اس کا عنوان ''اے حمید۔۔۔رومانوی افسانے کا ضعف گریہ'' بھی محل نظر ہے۔ دوسری طرف جناب قائم نقوی نے اے حمید کی وفات کے بعد اسے یاد کیا تو لکھا:

> ''اے حمید ہمارے عہد کی ان ہمہ جہت شخصیتوں میں سے تھے جو ایک اچھے ادیب، افسانہ نگار، ناول نگار، خاکہ نگار، سفرنامہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک وضعدار انسان بھی تھے۔ انہوں نے ساری عمر ادب کو ہی اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا اور ایک عہد کو اپنی تحریروں میں زندہ رکھا۔ ان کی نثر بے حد توانا دلکش اور اثر انگیز تھی جو قارئین اور سامعین کو اپنے سحر

میں لے لیتی تھی اردو زبان وادب کی تاریخ اے حمید کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔''

ممتاز افسانہ نگار انتظار حسین نے کہا:

''اے حمید اور میں نے ایک ہی زمانے میں لکھنے والوں کی حیثیت سے آنکھ کھولی، اس وقت اے حمید ایک رومانی روح کے طور پر نمودار ہوئے اور اپنے پڑھنے والوں کے دلوں کو تسخیر کر لیا۔ ہماری نسل کا وہ سب سے مقبول افسانہ نگار تھا۔ زندگی میں جیسے نشیب و فراز آتے ہیں، وہ اے حمید کی زندگی میں بھی آئے۔ مگر میرے دل و دماغ میں ابتدائی زمانے کا اے حمید بسا ہوا ہے۔'' اور اب یہ کہا جا سکتا ہے:

''مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا''
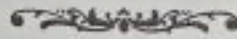
ڈاکٹر داؤد رہبر

پیدائش 1926 لاہور وفات 6 اکتوبر 2013 (فلوریڈا)

داؤد رہبر لاہور سے 1949ء میں انگلستان گئے تو مقصود نظر کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر ڈگری حاصل کرنا تھا لیکن علوم وفنون کی دنیا میں ایسے مستغرق ہوئے کہ گھر کا راستہ ہی بھول گئے۔ کبھی عزیز واقربا اور دوستوں سے ملنے کے لیے آتے تو لاہور میں لمبا قیام نہ کرتے۔ مسافرت کا تصور قائم رکھتے اور چند محفلیں جما کر واپس چلے جاتے۔ دوستوں سے ان کا مستقل رابطہ خطوط سے تھا۔ مرزا اسداللہ خان غالب کے بعد اردو خطوط نویسی میں جن ادیبوں کو شہرت عام اور بقائے دوام ملی ان میں مشفق خواجہ کے ساتھ داؤد رہبر کا نام بھی شامل ہے۔ اعجاز حسین بٹالوی اور ضیامحی الدین ان کے خطوط سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں ''پردیسی نویسی'' سے موسوم کیا اور اس خدشے کے تحت کہ یہ معلومات افزا تاثرات کا ذخیرہ ضائع نہ ہو جائے، داؤد رہبر کے خطوط جمع کر کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ داؤد رہبر کو معلوم ہوا تو انہوں نے ضیامحی الدین کو لکھا:

> ''استاد ذوق اپنے کلام کے اوراق بلکہ پرزے ایک گھڑے میں ٹھونس دیا کرتے تھے۔ غدر کے دنوں میں آزاد (محمد حسین) نے یہ خزانہ گھڑے سے نکالا اور اس کی گٹھڑی باندھ کر بھاگ نکلے۔ بھلا ہو لاہور کا جس نے ان کو پناہ دی۔ (اور ہم کو نہ دی) لاہور آ کر آزاد نے ''دیوان ذوق'' ترتیب دیا۔''

یہ تاریخی واقعہ لکھنے کے بعد داؤد رہبر نے اپنی خطوط نویسی کی کتھا چھیڑی:

''میرے ہاں خطوں کو گھڑے میں ٹھونسنے کی صورت نہ ہوئی۔ البتہ گتے کے بیسیوں ڈبے گھر میں اور دفتر میں جمع ہیں۔ ان سب کو کھنگالوں تو بہت سے خط اور نکلیں۔ ایک انبار خطوں کا البتہ خوش بختی سے یکجا مل گیا۔ اپنے خبطی کو اس پیش بینی پر داد دو۔ اس کی کہانی یہ ہے کہ 1961ء میں اردو خطوط نویسی کو خلوت کا مشغلہ بنایا۔ وطن سے دور بیٹھے یگانوں سے گفتگو کی اور صورت ہی کیا ہو سکتی تھی۔ جی میں آئی کہ ہر خط کی کاربن کاپی محفوظ کر لی جائے۔''

داؤد رہبر کے یہ خطوط دو ضخیم جلدوں میں ''سلام و پیام'' کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ خطوط نویسی ان کے اظہار و ابلاغ کی مستقل صنف بن گئی تھی اور متذکرہ دو جلدوں میں سینکڑوں خطوط کے چھپنے کے بعد بھی وہ دوستوں کے ساتھ اپنے حالات، خیالات، تصورات اور یادوں کا تبادلہ کرتے رہے کہ اچانک 16 اکتوبر 2013ء کو امریکہ کے شہر ''ڈیرفیلڈ'' (فلوریڈا) سے خبر آ گئی ''خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا''

اس وقت ان کی عمر 86 برس کے لگ بھگ تھی۔ پسماندگان میں ان کی بیوہ اور دو بیٹیاں تھیں جو اس غریب الوطنی میں ان کے پاس تھیں۔ انتظار حسین نے انگریزی اخبار ''ڈان'' (DWAN) میں خبر پڑھ کر اپنے کالم ''بندگی نامہ'' میں لکھا:

''وطن سے کالے کوسوں دور امریکہ کے شہر فلوریڈا میں اس عالم بے بدل نے جسے ہم داؤد رہبر کے نام سے جانتے تھے..... برسوں سے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ پاکستان سے تو وہ بہت پہلے سے سدھار گیا تھا..... اب دنیا سے بھی سدھار گیا۔''

انتظار حسین نے انہیں ''عالم بے بدل'' کہا ہے تو اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں۔

داؤد رہبر نے 1926ء میں لاہور میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کے گھرانے میں جنم لیا۔ شیخ محمد اقبال 1920ء کی دہائی میں عربی اور فارسی کے ممتاز ترین علماء میں شمار ہوتے تھے۔ اورینٹل کالج لاہور کے اساتذہ میں سے شمس العلماء مولوی عبدالرحمان، حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع اور مولوی عبدالعزیز ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ شیخ محمد اقبال بعد میں اورینٹل کالج کے پرنسپل بن گئے تھے اور اپنے گھر پر علمی و ادبی نشستیں جماتے جن کے حاشیے پر داؤد رہبر بیٹھ کر بزرگوں کی باتیں سنتے رہتے۔ داؤد رہبر اورینٹل کالج میں داخل ہوئے تو مولوی محمد شفیع اور حافظ محمود شیرانی سے انہیں شرف تلمذ بھی حاصل ہوا لیکن یہ کہنا مناسب ہے کہ ان کی تربیت کا گہوارہ ان کا گھر تھا جو ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی علمی شخصیت کی وجہ سے دبستان ادب بھی تھا۔ ایک اور شخصیت جس نے داؤد رہبر کے ذوق فنون لطیفہ کو سنوارا، خادم محی الدین تھے جو اگرچہ دیال سنگھ کالج لاہور میں ریاضی کے پروفیسر تھے لیکن کلاسیکی موسیقی سے بھی انہیں عشق تھا۔ والد کا بڑا بھائی ہونے کے ناتے خادم محی الدین ان کے تایا اور معروف ایکٹر ضیا محی الدین ان کے معاصر اور تایازاد بھائی تھے۔ راگ داری کا شوق انہیں اپنے تایا سے ملا اور اس کی پرورش میں ضیا محی الدین نے بھی حصہ لیا۔ ذوق کی یہ جہت بالکل نئی اور اس جہت سے الگ تھی جس کی تربیت انہیں اپنے والد محترم اور ان کے نامور رفقاء نے دی تھی۔ اعجاز حسین بٹالوی نے لکھا ہے۔

> ''اگر داؤد رہبر اسی محفل میں (یعنی ان کے والد کے دوستوں کی محفل) رہتے تو غالباً وقت سے پہلے بوڑھے ہو جاتے لیکن ایک خوشگوار حادثہ یہ ہوا کہ ان کے ہم عمروں نے ان کو اچک لیا اور ایک روز وہ ہمارے ساتھ حلقہ ارباب ذوق میں جا پہنچے۔ یہ چالیس کی دہائی کا قصہ ہے۔ اپنی نسل کے لوگوں کی یہ مجلس انہیں اچھی لگی۔۔۔ اور وہ اس کے ہفتہ وار اجلاس کے اسیر ہو گئے''۔

ادبی مضمون نگاری کا شوق داؤد رہبر کو حلقہ ارباب ذوق نے عطا کیا اور اس ذوق کی

تربیت کا فریضہ مولانا صلاح الدین احمد نے ادا کیا جن کا رسالہ ''ادبی دنیا'' اس دور میں جدید ادب کا نمائندہ رسالہ شمار ہوتا تھا اور مولانا کو ادیب گر کا منصب حاصل تھا۔ داؤد رہبر کی ایک ادبی کاوش اپریل 1949ء کے ''ادبی دنیا'' میں ''لمحے'' کے عنوان سے شائع ہوئی تو اس کی پذیرائی والہانہ انداز میں ہوئی۔ مولانا صلاح الدین احمد نے اپنے اداریہ میں جو ''بزم ادب' کے عنوان سے چھپتا تھا----- لکھا:

> ''ہمارے نوجوان دوست جناب داؤد رہبر نے اس بار ایک چھوٹا سا مضمون ''لمحے'' لکھا ہے جسے انشاء پردازی کا ایک لطیف نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ زبان کی سلاست، بیان کے زور اور مطالب کی فراوانی کے اعتبار سے یہ ایک نہایت متوازن فن پارہ ہے اور ہمیں امید ہے کہ بعض اور اہل قلم بھی اسی انداز میں طبع آزمائی کریں گے۔''

داؤد رہبر نے ''لمحے'' میں زندگی کے خارج سے ذات کے داخل کی طرف غیر منضبط سا سفر کیا اور ایسی انشائی کیفیت پیدا کی جو موضوع کو نئے معانی سے سرفراز کر دیتی ہے۔ یہاں اس مضمون کا مختصر سا اقتباس مجھے بے محل نظر نہیں آتا۔

> ''آج پھر دھوپ نکلی، کل بھی نکلی تھی، اس طرح گرم، شفقت بھری، تھپکیاں دیتی ہوئی۔ مگر یہ کل والی دھوپ نہ تھی۔ وہ دھوپ مر چکی، یہ نئی دھوپ تھی، ہر لمحہ نئی دھوپ، ہر لمحہ نئی گرمی..... لمحہ کیا ہے؟ یہ تسبیح کے دانوں کی طرح نہیں، وقت تو گرتے تارے کی لکیر ہے، ہر نقطے پر ٹھہرا ہوا۔ پھر بھی رواں..... لمحہ کیا وقت کے چہرے پر ایک خال ہے؟ ایک لفظ؟ جسامت، بے طول، بے عرض، مگر لفظ کتنا ہی باریک ہو موہوم نہیں ہو سکتا۔''

داؤد رہبر نے اس نوع کے متعدد مضامین لکھے لیکن وہ ایسے آزادہ فطرت تھے کہ ''انشائیہ'' کے فنی قواعد وضوابط کی پیروی ضروری نہیں سمجھی۔ چنانچہ ان کی کتاب ''نسخہ ہائے وفا''

اور ''تسلیمات'' کے متعدد مضامین میں انشائیہ کے کچھ عناصر تلاش کیے جاسکتے ہیں لیکن ''لمحے'' جیسا ڈھلا ڈھلایا، ترشا ترشایا اور سجا سجایا انشائیہ داؤد رہبر پر دوبارہ نہیں اترا اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے شعوری طور پر انشائیہ نگار بننے کی کوشش ہی نہیں کی اور اس کے برعکس انشاء پردازی میں اپنے ذاتی اسلوب کو جس کی رعنائیاں منفرد ہیں فطری تحفظ عطا کیا۔ ''بالسم کے پودے''، ''ٹیلے کی روشنی'' اور ''چمن آرائی'' وغیرہ اسی قسم کے دل آویز مضامین ہیں۔

داؤد رہبر نے عربی ادب میں ایم اے گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا اور پھر کچھ عرصے تک اورینٹل کالج لاہور میں عربی زبان و ادب کے معلم کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ان کا آئیڈیل ان کے والد ڈاکٹر شیخ محمد اقبال تھے جن کی آزادہ روی، کشادہ نظری اور علم دوستی کے علاوہ فطرت پرستی کے واقعات داؤد رہبر نے اپنے مضمون ''ابا جان'' میں پیش کیے ہیں۔ ان کی سوانح حیات انگریزی میں لکھی لیکن کہا جاتا ہے کہ پاکستان کا کوئی ناشر اسے چھاپنے پر آمادہ نہ ہوا۔ بالآخر داؤد رہبر نے اپنی یہ تالیف ایک غیر ملکی ناشر سے محدود تعداد میں چھپوائی اور اس کے کچھ نسخے اپنے مخصوص دوستوں کو بھجوا دیئے۔ ڈاکٹر انور محمود خالد مجھے بتا رہے تھے کہ لاہور میں اس نادر سوانح عمری کا ایک نسخہ معروف محقق محمد اکرام چغتائی کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے لیکن وہ بوجوہ کسی کو دکھاتے نہیں۔

کیمبرج سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد داؤد رہبر 1953ء تک انگلستان میں قیام پذیر رہے۔ اس کے بعد انہیں ترکی، کینیڈا اور امریکہ میں تعلیمی خدمات انجام دینے کے مواقع ملتے رہے۔ 1968ء میں بوسٹن یونیورسٹی میں انہیں مختلف مذاہب کے تقابلی مطالعے کا معلم مقرر کیا گیا۔ عالمی مذاہب میں سے انہوں نے اسلام، عیسائیت، ہندومت اور کنفیوشیزم کا خصوصی تہذیبی مطالعہ کیا اور ان کے بارے میں پھیلائی گئی گرد کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر داؤد رہبر کے یہ مطالعے ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے رسالہ ''نیا دور'' کے ایک خاص نمبر میں شائع کیے تھے۔ انگلستان جانے سے پہلے اردو ادب میں ان کا نام معروف ہو چکا تھا لیکن انگلستان اور امریکہ میں

قیام کے دوران انہوں نے اپنے اظہار کے لیے انگریزی زبان کو قبول کیے رکھا۔ صرف دوستوں کو خطوط لکھتے تو اردو کو استعمال میں لاتے۔ 1990ء میں بوسٹن یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے اور مستقل آباد کاری کے لیے فلوریڈا کو منتخب کر لیا تو زیادہ کام اردو میں ہی کیا۔ اس دور میں ہی انہوں نے کلاسیکی موسیقی کے ممتاز گائیکوں پر ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جو پہلے دہلی سے اور پھر لاہور سے ''باتیں کچھ سریلی سی'' کے نام سے شائع ہوا۔ آغا بابر نے ان کا 1979ء کا ایک طویل خط ڈاکٹر وزیر آغا کو ''اوراق'' میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا جو محمد ایوب اولیا کے اس سوال کے جواب میں لکھا گیا تھا کہ داؤد رہبر کو گائیکوں میں سے استاد فیاض علی خان مرحوم بہت زیادہ کیوں پسند ہیں؟ داؤد رہبر نے جواب میں پورا مقالہ خط کی صورت میں لکھ دیا جو سالنامہ ''اوراق'' جنوری 1980ء میں چھپا۔ اس خط میں انہوں نے اپنی سند کی معنویت کو فن کی ٹیکنیک سے ابھارنے کی بجائے جذبے کی تاثراتی شدت سے پیش کیا ہے۔ مختصر سا اقتباس ملاحظہ کیجئے جس میں تقابلی موزانہ بھی شامل ہے:

> ''آپ نے پوچھا ہے کہ خاص استاد فیاض علی خان مرحوم کا تو کیوں قائل ہوا؟ اس کا سادہ جواب یہ ہے کہ یہ مزاج کی بات ہے۔ آفتاب موسیقی کا گانا اسے پسند آئے گا جو شکست کو ناپسند کرتا ہے۔ خان صاحب مرحوم کی گائیگی فاتحانہ گائیکی ہے۔ یوں تو آگرہ گھرانا پہلے ہی فتح مندی کا گھرانا تھا لیکن استاد مرحوم نے اسے ایسی فتح کا آئینہ کر دیا جس میں کمند اور کمین گاہ اور کھینچی کا کوئی نام نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ فتح تلوار کی فتح بھی نہیں، یہ قوت کردار کی فتح ہے۔ استاد فیاض علی خان کا گانا سننے سے حوصلہ بڑھتا ہے۔ آپ فرمائیں گے کہ پٹیالے کے تان کپتان بھی نڈر لوگ ہیں اور جرات کا پیغام دیتے ہیں، اس سے مجھے انکار نہیں لیکن استاد فیاض خان کے گانے میں فتح پور سیکری کی دربار داری کے آداب ہیں اور

پٹیالے والوں کے ہاں عام بول چال کی بے تکلفی ہے۔ پٹیالے والے
ہنس بول کر گاتے ہیں۔ بیچ میں لطیفہ بھی کہہ جاتے ہیں اور بے ضرر گالی
بھی سروں کے روپ میں جڑ دیتے ہیں۔ آگرے والے راگ راگنی کو
شاندار کر کے پیش کرتے ہیں۔ سجاوٹ میں شکوہ سلطانی ہے، دیہاتی
چودھریت نہیں آگرہ گھرانے کی گائیکی باادب ہوشیار گائیکی ہے۔''

(اوراق سالنامہ 1980ء ص23)

داؤد رہبر نے انسانی مطالعات کی طرف رخ کیا تو پراگندہ طبع لوگوں کے خاکے
لکھے اور ''پراگندہ طبع لوگ'' کے نام سے ہی کتاب چھاپی ، وہ خاکے کو اپنی یادوں سے آراستہ
کرتے، واقعات کو دستاویزی ثبوت کے طور پر پیش کرتے اور اپنے محسوسات کو لگی لپٹی رکھے
بغیر بیان کر دیتے۔ انہیں اعجاز حسین بٹالوی سے لاہور میں قرب مکانی رہا۔ انگلستان میں دونوں
بل کر وطن عزیز کی یادوں کا تبادلہ وتجدید کر دیتے۔ دونوں میں بعد مکانی پیدا ہوا تو خط نگاری نے
اتحاد قلبی قائم رکھا۔ اعجاز بٹالوی کی وفات کے بعد ان کا خاکہ لکھا تو ان کے وہ اوصاف گنوائے
جو داؤد رہبر کے ذاتی مشاہدے میں آئے تھے:

''مرحوم (اعجاز حسین بٹالوی) کا مزاج جوانی کے لیل ونہار میں کھلنڈرا
ضرور تھا لیکن اسے رندانہ کہنا غلط ہوگا۔ بعض مہذب رندوں سے ان کی
یار باشی ضرور تھی لیکن یہ خود رند نہ تھے۔ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ان کی
جھجک دور ہو جاتی تھی لیکن طبعاً یہ شرمیلے آدمی تھے۔ اور احترام ان کا
مسلک تھا۔''

دوسری طرف ان کی قلم کاری کا ذکر آیا تو داؤد رہبر نے تیکھے اجمال سے کام لیا۔
''اعجاز صاحب کی مؤرخانہ اور ناقدانہ تحریریں ان کی افسانوی تحریروں
سے بہتر ہیں۔ افسانے انہوں نے اپنے برادران عاشق صاحب، خادم

حسین صاحب اور آغا بابر کی دیکھا دیکھی، لکھے اور وہ بھی کبھی کبھار تفریحاً۔ چھیڑ چھاڑ والے افسانے لکھتے تھے۔ اعجاز کی طبیعت شرمیلی تھی۔ عشقیہ افسانے لکھتے تھے تو نسوانیت کے جبلی احترام کے باعث ان کے بیان میں کھلی ڈلی بے لگانہ رندانہ بے باکی نہ ہوتی۔"

نوے کی دہائی میں داؤد رہبر کو آپ بیتیوں سے خصوصی رغبت پیدا ہوگئی تھی۔ سعید شیخ کے رسالہ "علامت" میں انہوں نے متعدد مشاہیر کی آپ بیتیوں پر تجزیاتی مضامین لکھے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر پرویز پروازی کو یہ مضامین پڑھ کر ہی آپ بیتیوں کے تجزیاتی مطالعات میں تخصیص پیدا کرنے کا خیال آیا اور انہوں نے "پس نوشت" کے عنوان سے کم وبیش اڑھائی صد خودنوشت سوانح عمریوں پر اپنے مضامین کی کتابیں پیش کیں۔ پرویز پروازی صاحب نے "پس نوشت" کا دوسرا حصہ داؤد رہبر کے ملاحظے کے لیے بھیجا تو انہوں نے کتاب چھپنے سے قبل پروازی صاحب کے تبصروں پر اپنے تاثرات بے لاگ انداز میں لکھے :

"احمد بشیر سے آپ ناخوش ہیں اس لیے کہ ان کے نام کے ساتھ جس بے خوفی اور برملا گوئی کا تصور وابستہ ہے وہ (آپ بیتی میں) سامنے نہیں آتا اور ان کی آپ بیتی "سرگزشت اسیرانا" معلوم ہوتی ہے۔ ان سے آپ کو شکایت یہ ہے کہ انہوں نے مولانا عبدالمجید سالک کو مبہم کیا ہے۔"

داؤد رہبر شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ لندن کے اردو مرکز کے منتظمین الطاف گوہر اور افتخار عارف نے 1988ء میں انہیں مدعو کیا کہ وہ امریکہ سے آئیں اور داغ دہلوی کی شاعری پر مقالہ پڑھیں۔ "اردو شاعری میں پیروڈی نگاری" کے موضوع پر ان کا تحقیقی مقالہ ایک بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ داؤد رہبر غزل کہتے تھے لیکن "آمد" اور "آورد" کی قید سے آزاد تھے۔ دوستوں کو خطوط لکھتے تو اس دوران میں ان پر غزل کے اشعار بھی اترنے لگتے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی غزلیں ادبی رسائل میں کم کم ہی چھپوائیں۔ محدود

مقدار میں ایک مجموعہ غزل خود چھاپا اور دوستوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک غزل نگار کی حیثیت میں ان کا ذکر میں نے کسی تنقیدی کتاب یا جائزے میں نہیں دیکھا۔

داؤد رہبر کا ایک بڑا کارنامہ غالب کے دو سو خطوط کا انگریزی میں ترجمہ اور اس کے مفصل حواشی مرتب کرنا بھی ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ این میری شمل نے لکھا اور یہ کتاب ہارورڈ یونیورسٹی نے نیویارک ایشیاء سوسائٹی کے حوالے سے شائع کی تھی۔ اعجاز بٹالوی کو اس کتاب کا ایک نسخہ ڈاک سے ملا تو پہلے صفحے پر داؤد رہبر نے لکھا تھا:

"بھئی دیکھو بوسٹن میں رہتے ہوئے بھی ہم نے محلہ بلی ماراں میں آمد و رفت کی صورت نکال لی۔"

دکھ کی بات یہ ہے کہ 16 اکتوبر 2013ء کو داؤد رہبر اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو علم و دانش کا وہ چراغ بجھ گیا جس کی تہذیبی روشنیاں فلوریڈا (امریکہ) سے پاکستان میں پہنچتی اور ہر طرف اجالا پھیلاتی تھیں۔
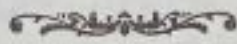
حفیظ تائب

ممتاز نعت نگار مظفر وارثی کے سامنے جب کسی نے کہا "ہمارے ہاں تقریباً ہر بڑے نعت گو نے آغاز غزل سے کیا لیکن جب نعت کی طرف آئے تو غزل گوئی ترک کر دی" اور ثبوت بیان کے طور پر حفیظ تائب اور حافظ لدھیانوی کی مثال دی تو مظفر وارثی نے بلا تامل کہا "حفیظ تائب کو آپ اس صنف میں نہ لائیں۔ انہوں نے بہت کم غزلیں کہی ہیں۔ نعت کی طرف ان کا رجحان زیادہ رہا ہے۔" مظفر وارثی کے اس "قول فیصل" سے بالواسطہ طور پر میں ایک یہ نتیجہ اخذ کرنے میں شاید حق بجانب ہوں گا کہ اردو کے قریباً تمام شعراء نے غزل کو اپنی ادبی شہرت کا وسیلہ بنایا اور اس سے نام و نمود حاصل کر کے دوام ابد حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن حفیظ تائب غزل سے رسمی آغاز کرنے کے بعد فوراً نعت کی طرف آ گئے تھے تو وہ اس احساس سے معمور تھے کہ

نعت حضرتؐ میری پہچان ہے، سبحان اللہ   یہی دنیا، یہی ایمان ہے، سبحان اللہ

جس سے پہلے کسی تخلیق کا عنوان نہ تھا   وہ مرے شعر کا عنوان ہے، سبحان اللہ

اور اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے جب یہ شعر کہا

سیرت ہے تری جوہر آئینہ تہذیب

روشن ترے جلووں سے جہاں دل و دیدہ

تو وہ نعت نبویؐ کے وسیلے سے اپنی دنیاوی زندگی کے تمام زاویوں کو منقلب کر چکے تھے

اور یہ سالک راہ حق ایک جذبہ بے اختیاری کے تحت تسلیم کر رہا تھا کہ

بے نیازی آپؐ کی وابستگی نے کی عطا

میں غنی کوئے پیغمبرؐ کی گدائی سے ہوا

حفیظ تائب کا اپنا بیان ہے کہ

''میں گیارہ بارہ سال کی عمر میں نعت خوانی کرنے لگا تھا۔ میٹرک میں سکول کی لائبریری سے میں نے مولانا ظفر علی خان کی کتابیں جاری کروا کر ان کا نعتیہ کلام اپنی کاپی پر لکھنا شروع کر دیا۔ ادھر بشیر منذر جیسا ساتھی اور مولانا بشیر احمد صمصام جیسے استاد میسر آئے تو میرا ادبی ذوق نکھرنے لگا۔ قاری احمد حسن مرحوم کے لحن داؤدی میں مولانا احمد رضا بریلویؒ کا نعتیہ کلام سننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ محمد یوسف چشتی گجراتی نعت خواں کی دوستی بھی آڑے آئی۔ محمد اعظم چشتی کی نعت خوانی نے مہمیز کا کام کیا۔ چنانچہ میں نعتیں لکھنے لگا.... کالج میں اور کچھ عرصہ بعد تک نعت کے ساتھ نظم اور غزل بھی لکھتا رہا۔ پھر جب مصروفیات حد درجہ بڑھنے لگیں اور انتخاب کا مرحلہ آیا تو میں نے اپنے لیے نعت مبارک منتخب کر لی۔ پھر رفتہ رفتہ طبیعت نعت میں یوں ڈوبتی گئی کہ کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔'' (عمران نقوی کو انٹرویو)

عشق نبویؐ میں ڈوب کر اور حضوری کی کیفیت اپنے دل پر وارد کر کے حفیظ تائب نے سچے جذبے سے نعت کہی تو ان کے لفظوں کو پر لگ گئے اور ان کی نعتوں کا کیف دیوار چمن عبور کر گیا۔ چنانچہ کینیڈا کے ایک شہر ٹورنٹو میں وہ مشاعرہ میں اپنی پسند کی نعت پڑھنے لگے تو مشاعرہ ہال کے کونے کونے سے فرمائش کی جانے لگی کہ وہ نعت سنایئے جس کا مطلع ہے:

دے تبسم کی خیرات ماحول کو، ہم کو درکار ہے روشنی یا نبیؐ
ایک شیریں جھلک ایک نوریں دمک، تلخ و تاریک ہے زندگی یا نبیؐ

اور شگاگو میں انہیں مشاعرے کی صدارت اس لیے پیش کی گئی کہ وہاں کے لوگ مشاعرے کے آخر میں ان سے جی بھر کر نعتیں سننا چاہتے تھے اور اس حقیقت کے تو ہم سب شاہد ہیں کہ حفیظ تائب کے جسم و جان پر کینسر نے آخری جان لیوا حملہ کیا تھا تو اس وقت بھی دہر کی تاریکیوں کو دور کرنے کے لیے وہ نبی اکرمؐ سے روشنی کی خیرات مانگ رہے تھے۔ اور اس التجا میں ان کا اپنا ماجرائے دل بھی شامل تھا:

دشمن جاں ہوا میرا اپنا لہو، میرے اندر عدو، میرے باہر عدو
ماجرائے تحیر ہے پرسیدنی، صورت حال ہے دیدنی یا نبیؐ

جن لوگوں نے حفیظ تائب کو محفلوں میں نعت پڑھتے ہوئے سنا ہے، ان میں میرے کرم فرما ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی بھی شامل ہیں جو نہ صرف خود اعلیٰ پائے کے نعت نگار ہیں بلکہ کسی کو نعت پڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں تو پہچان جاتے ہیں کہ الفاظ مدینے کے قریوں سے روضۂ نبویؐ کے بوسے لے کر ادا ہو رہے ہیں یا نعت میں صرف غزل کے محبوب کو تبدیل کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ رسالہ ''نعت رنگ'' کے مدیر صبیح رحمانی کے نام ان کے ایک مکتوب کا اقتباس پروفیسر شبیر احمد قادری نے حال ہی میں پیش کیا ہے جس میں انہوں نے حفیظ تائب کی نعت گوئی کا ذکر کیا ہے۔ اور اس مخصوص زاویے سے حفیظ تائب کی تحسین کا حق ادا کر دیا ہے۔ کشفی صاحب لکھتے ہیں:

''حفیظ تائب سے میرے رشتے کو کچھ کچھ تم جانتے ہو۔ ان کی آنکھوں میں شب بیداری کے بھی شاہد تم ہو۔ ایک بار ٹیلی ویژن پر نعتیہ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ میرے ساتھ میرے عزیز اور بہت خوش گو شاعر محمد رئیس علوی بھی یہ مشاعرہ دیکھ اور سن رہے تھے۔ جب بہت سے داد طلب اور ادعا برلب شاعر کلام پڑھ چکے۔۔۔ تو حفیظ تائب صاحب نے نعت شروع کی۔ لہجہ محبت اور ادب کے سانچے میں ڈھلا ہوا۔ اور نگاہیں یوں جھکی ہوئی جیسے مواجہ شریف میں کھڑے ہوں، پورا وجود دست بستہ۔۔۔ آواز نرم۔۔۔ مؤدب اور نبی کریمؐ کے احساس سے پست۔۔۔ ''اے اہل ایمان اپنی آوازوں کو نبی کریمؐ کی آواز سے بلند نہ کرو۔۔۔'' ہزاروں میل کے فاصلے پر حضورؐ کا یہ احساس اور یہ شرف۔۔۔ اللہ اکبر''

ادّعا طلب شاعروں کے ہجوم میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے حفیظ تائب کی نعت گوئی کے جس منفرد زاویے کا ذکر کیا ہے خود مجھے بھی اس کے مشاہدے کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ وہ نعت پڑھنے لگتے تو ان کا وجود محفل سے عنقا ہو جاتا۔ صرف ان کے ہونٹ ہلتے نظر آتے اور یوں

محسوس ہوتا کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر کلام منظوم پیش کرنے کی بجائے روضۂ اقدس کی جالیوں کو چوم رہے ہوں اور ہدیۂ نعت حضوری کی کیفیت میں پیش کر رہے ہیں۔ میں اس نکتے کا تمام کریڈٹ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کو دیتا ہوں لیکن یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ نعت پڑھتے وقت جو کیفیت حفیظ تائب پر طاری ہو جاتی تھی، وہ بہت کم شاعروں میں دیکھنے کا احساس ہوا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ حفیظ تائب نے نعت نگاری کے لیے اپنی بوطیقا خود مرتب کر رکھی تھی جس کی ایک ایک شق پر وہ خود عمل کرتے اور دوسروں کو عمل کی تلقین کرتے تھے۔ یہ بوطیقا حسبِ ذیل ہے:

نعت گوئی کے لیے حسن ارادت شرط ہے ساتھ کچھ فہم کتاب و علم سیرت شرط ہے
اس میں لازم ہے جمال فن بھی اوج فکر بھی جتنی ممکن ہو خیالوں کی طہارت شرط ہے
گر ادب پہلا قرینہ ہے ثناء کے شہر میں ہر قدم اس راہ میں عجز طبیعت شرط ہے

اس بوطیقا پر عمل ہی کا نتیجہ ہے کہ حفیظ تائب کی نعت میں قرآن مجید کے مفاہیم مطالب اور مضامین لاشعوری طور پر شامل ہوتے چلے جاتے ہیں اور بعض اوقات تو یہ بھی محسوس ہوتا کہ ان پر نعت کا نزول قرآن مجید کی تلاوت کے دوران ہوتا ہے۔

نبیؐ کے ہر سخن میں ہے جھلک وحی الٰہی کی حدیث مصطفٰے پر مرحبا کہیے، بجا کہیے
(النجم۔4-3)

افسوس اس بات کا ہے کہ اردو ادب اور پاکستان کی صفوں سے قلب تپیدہ سے نعت کہنے والا یہ شاعر گزشتہ برس اٹھ گیا۔ اور اب ہم طیورِ قدسی کے اس ہم زباں کی پہلی برسی منا رہے ہیں تو دعا کر رہے ہیں کہ

''اللہ تعالیٰ حفیظ تائب مرحوم کے درجات بلند کرے۔''

اور میں تو پورے یقین سے یہ کہہ رہا ہوں کہ حفیظ تائب حضور نبی اکرمؐ کی حضوری میں نعت خوانی اور نعت نگاری کے لیے اس دنیا سے رختِ سفر باندھ کر عقبیٰ کو سدھار گئے ہیں۔ حق مغفرت کرے۔ حق مغفرت کرے۔

خالد احمد

مجھے فکر مندی تو اسی دن سے لاحق ہو گئی تھی جب سنا کہ خالد احمد کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے لیکن جب ان کا کالم ''لمحہ لمحہ'' روزنامہ ''نوائے وقت'' میں چھپنے لگا تو معلوم ہوا کہ خالد احمد صحت یاب ہو کر گھر واپس آ گئے ہیں اور حسب معمول محفل آرائی میں مصروف ہیں اور دوستوں کو اپنے لطیفوں کی سوغاتیں عطا کر رہے ہیں۔ پھر ان کی شاعری کی نئی کتاب ''نم گرفتہ'' کی تقریب رونمائی کی خبر آئی تو خوشی ہوئی کہ اس کی صدارت رسالہ ''فنون'' کی مدیرہ ڈاکٹر ناہید قاسمی نے کی تھی اور اس تقریب میں خالد احمد کی شرکت اس بات کی شاہد تھی کہ اپنی فعال زندگی کی تگ و تاز جنونانہ میں خالد احمد کی بیماری نے رخنہ اندازی نہیں کی تھی لیکن 13 مارچ کو طلوع فجر سے پہلے موبائل کی گھنٹی کے ساتھ ناصر بشیر کا فون نمبر طلوع ہوا تو دل سے دعا نکلی۔۔۔ ''خدا خیر کرے'' اور جب ان کا مختصر پیغام پڑھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ خبر روح فرسا تھی کہ ''خالد احمد پرائیڈ آف پرفارمنس'' کا انتقال ہو گیا تھا۔ پھر ہر طرف سے کرب انگیز فون آنے لگے۔ آنکھوں میں تر مرے تیرنے لگے اور کان میں یہ صدا گونجنے لگی ''موت سے کس کو رستگاری ہے۔''

خالد احمد اردو ادب کے معمولی نہیں غیر معمولی فرد تھے۔ ان کے خاندان کا ادب سے گہرا تعلق تھا۔ والد مصطفیٰ خان شاعر تھے۔ سنجیدہ شاعری کے لیے ان کا تخلص ''مداح'' تھا لیکن انہیں قبول عام ظریفانہ شاعری سے ملا اور احمق پھپھوندوی کے نام سے معروف ہوئے۔ ان کی دوستی پولیس کے ایک افسر تہور احمد خان سے تھی۔ دونوں کو شکار کا شوق تھا۔ تعلقات اتنے گاڑھے ہو گئے کہ دونوں میں یہ معاہدہ طے پا گیا کہ پہلے راہی ملک عدم ہونے والے کے خاندان کی کفالت دوسرا زندہ دوست کریگا۔ اب اتفاق دیکھئے کہ تہور احمد خان کو کوہ ندا سے پہلے آواز آ گئی اور وہ پسماندگان میں سات بیٹیوں، ایک بیٹے اور بیوہ انور جہاں کو چھوڑ گئے۔ اردو کی دو ممتاز

افسانہ نگار بہنیں خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور اور معروف صحافی توصیف احمد خان انہیں تہور احمد خان کی اولاد میں شامل تھے۔ جناب مصطفیٰ خان مداح نے ایفائے عہد کیا اور تہور احمد خان کی بیوہ انور جہاں سے عقد ثانی کر لیا اور مرحوم دوست کے پورے کنبے کی کفالت شریفانہ اور شاہانہ انداز سے ادبی ماحول میں کی۔

خالد احمد 1940ء کے لگ بھگ انہیں مصطفیٰ خان احمق پھپھوندوی کے ہاں انور جہاں کے بطن سے پیدا ہوئے۔ تشکیل پاکستان کے بعد یہ خاندان لاہور منتقل ہو گیا تو اس وقت خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسور اردو ادب میں افسانہ نگار کی حیثیت میں معروف ہو چکی تھیں اور ان کے ادبی راہنما احمد ندیم قاسمی تھے۔ جن سے ربط و تعلق خط و کتابت سے لکھنو میں ہی قائم ہو چکا تھا۔ لاہور میں اس کنبے کی سرپرستی اور نگہداشت قاسمی صاحب نے ہی کی۔ خالد احمد تعلیم مکمل کرنے کے بعد واپڈا میں ملازم ہو گئے اور 60 برس کی عمر کو پہنچے تو پی آر او کے عہدے سے ریٹائر ہو گئے۔

خالد احمد اپنے والد احمق پھپھوندوی کا ذکر کم کم کرتے تھے لیکن یہ بتانے سے گریز نہ کرتے کہ وہ علم دوست شخصیت تھے اور انہیں سنسکرت زبان سیکھنے کا شوق بزرگی میں ہوا اور جس استاد سے سنسکرت سیکھی اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ خالد احمد اعتراف کرتے کہ انہیں ''سیکھنے'' کی لگن وراثت میں ملی اور وہ ہر آدمی کی بات سے اپنا مفہوم اخذ کر کے مزہ لیتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ باپ کی طرف سے ان کی سوتیلی بہنوں خدیجہ مستور اور ہاجرہ مستور نے افسانے میں نام اور مقام پیدا کیا لیکن خالد احمد نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔ ان کے بچپن میں احمد ندیم قاسمی کو ملنے کے لیے اس دور کے ممتاز شعرا فیض احمد فیض، ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت آتے تو شعر و ادب کی باتیں سننے کا موقع خالد احمد کو بھی ملتا اور ان کے اندر یہ احساس جاگ اٹھتا کہ وہ بھی شعر کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ زبیر کے قلمی نام سے غزلیں لکھ کر اخبار ''امروز'' میں چھپوانے لگے جس کے ایڈیٹر احمد ندیم قاسمی تھے لیکن انہیں پتہ

نہیں تھا کہ زبیر کے پردے میں خالد احمد چھپا ہوا ہے۔ روحی کنجاہی نے ایک دن یہ راز فاش کردیا تو قاسمی صاحب نے پریس سے ''فنون'' کا زیر اشاعت پرچہ منگوایا اور جس غزل پر زبیر کا نام چھپا تھا اسے خالد احمد کے اصلی نام سے موسوم کیا۔ اس دور میں وہ کہانیاں اور مضامین بھی زبیر کے نام سے لکھتے تھے لیکن اب خالد احمد منظر پر طلوع ہو گیا تو انہوں نے ادب میں امتیازی نقوش ظاہر کرنے اور اپنی انفرادیت کا احساس دلانا شروع کر دیا اور جلد ہی یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ خالد احمد نے پہلی محبت ''لفظ'' سے کی تھی اور ہر وقت ''لفظ کی بوقلمونی اور تنوع کی جستجو ان کا مقصد ادب بن گیا۔ وہ اس کوشش میں سرگرداں رہے کہ ان کے استعمال میں آیا ہوا ''لفظ'' دوبارہ ان کی دسترس میں آئے تو ویسا نہ رہے جیسا کہ پہلے تھا۔ وہ گونگے لفظ کی گویائی کے قائل تھے اور ان کا ایقان تھا کہ اگر ان کے لفظ بول پڑے تو وہ اپنی داخلی خوبصورتی کے مظہر بن جائیں گے۔ ان کی شاعری میں معنی کی سطح اگرچہ اکہری ہے لیکن انہوں نے اردو غزل کو اپنی جدت سے نئے معانی سے سرفراز کیا ہے اور باور کیا جاتا ہے کہ ان کے مضمون کو اپنے تخلیقی عمل سے کوئی دوسرا اثر آفریں نہیں بنا سکتا اور اس لحاظ سے ان کے ہر شعر پر ان کے دستخط ثبت ہیں۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں:

میں سمندر تھا، مگر ویراں تھا صحرا کی طرح
سطح پر خاموشیوں کی گونج ہے نوحہ کناں

میرے گھر تک چل کے آتا، اتنا پیاسا کون تھا
اپنی گہرائی کے دریا میں جو ڈوبا کون تھا

○

اشک برسے تو دروں خانۂ جاں سیل گیا
پھول سے باس جدا، فکر سے احساس جدا

درد چمکا تو در و بام بھی گیلے نہ رہے
فرد سے ٹوٹ گئے فرد قبیلے نہ رہے

○

نیند سی نیند ہے، تھکن سی تھکن
اک دھندلکے میں عمر بیت چلی

ایک پو ہے کہ پھوٹتی ہی نہیں
تیرگی ہم سے روٹھتی ہی نہیں

خالد احمد کی شاعری کی کتابوں میں ''ہتھیلیوں پر چراغ''، ''پہلی صدا پرندے کی'' اور ''ایک مٹھی ہوا'' شامل ہیں۔ آخری مجموعہ ''نم گرفتہ'' انتقال سے چند روز پہلے شائع ہوا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ خالد احمد نے اپنے فکری اظہار کے برعکس اپنے ان داخلی سچے جذبوں کو فوقیت دی جن سے خالق کائنات کی حمد اور محبوبؐ دو عالم کی نعت کا حق ادا ہوتا تھا۔ یہ نعتیہ قصیدے ان کی پہلی کتاب ''تشبیب'' میں شامل ہیں اور وہ عقیدت کی نغمگی کے عجب رنگ بکھیرتے نظر آتے ہیں۔

ہر نفس ولولۂ وحوصلۂ مدح رسولؐ — رافع تذکرۂ خیرِ ورا سے مانگا

جاں حق نور ونم ارض وسما سے مانگی — دل حق آیہ لولاک لما سے مانگا

خالد احمد کی موت ایک منفرد انسان، ایک منفرد شاعر کی موت ہے۔
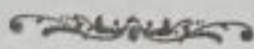
رشید حسن خان

اردو تحقیق کے خانِ خاناں رشید حسن خان 31 دسمبر 1989ء کو دہلی یونیورسٹی کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور انہوں نے دہلی میں قیام کا ارادہ ظاہر کیا تو مخمور سعیدی صاحب نے لکھا:

''میں اسے دہلی اور اہل دہلی کی خوش نصیبی پر محمول کرتا ہوں کہ خان صاحب شاہجہان پور واپس نہیں گئے اور دہلی کو اپنا مستقر بنالیا۔ کسی شہر میں ان جیسے لوگوں کی موجودگی اس شہر کے علمی اور ادبی منظرنامے کو وقار اور امتیاز بخشتی ہے اور وہاں کی تہذیبی زندگی کو تابانی و درخشانی عطا کرتی ہے۔ خان صاحب جن تہذیبی قدروں کے امین ہیں موجودہ دور میں ان کی پامالی کا منظر عام ہے، لیکن خان صاحب سے مل کر یہ منظر جیسے دھندلانے لگتا ہے اور حالی کا یہ مصرع مجسم ہو کر سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔

''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں''

رشید حسن خان کا یہ فیصلہ دہلی کے ان اہلِ علم کے لیے خوش آئند تھا جو ان کے علمی اور ادبی مرتبے سے آشنا تھے اور ادب کے مشکل مسائل میں ان سے رہنمائی حاصل کرتے تھے لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی، ہر چند ملازمت سے آزادی کے بعد وہ اپنے پورے وقت کے حکمران تھے اور تحقیق و تدوین کے متعدد جاں کاہ اور صبر طلب منصوبوں کی تکمیل میں مصروف تھے۔ لیکن صحت نے دہلی میں زیادہ لمبے عرصے تک قیام کی اجازت نہ دی اور وہ واپس اپنے وطن مالوف شاہجہان پور تشریف لے گئے۔ وہیں 26 فروری 2006ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ٹیلی فون پر رات کے اول پہر مجھے خبر دی تو ان کی آواز بھرائی ہوئی

تھی۔ انہوں نے اس خبر کی تصدیق شاہجہان پور سے کر لی تھی.... پھر دیر تک ہم ملال کرتے رہے کہ نثار احمد فاروقی، مشفق خواجہ اور شان الحق حقی کے بعد اردو ادب کا ایک اور مضبوط ستون گر گیا ہے اور اب اس منظرنامے کا:

''اک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی''

رشید حسن خان اردو محققین کے اس قبیلے کے فرد تھے جس میں حافظ محمود خان شیرانی، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولانا امتیاز علی خان عرشی شامل تھے، ان اصحاب میں قدر مشترک یہ تھی کہ وہ تحقیق کو جستجوئے صداقت اور تلاش حقیقت کا درجہ دیتے تھے اور اپنے بازیافتہ نتائج میں مروت، مصلحت، تعلق داری اور لگاؤ کو خاطر میں نہ لاتے تھے ان کا آئین تحقیق، حق گوئی و بے باکی تھا اور اس روایت کو ہی رشید حسن خان نے نہ صرف قبول کیا بلکہ اس کی توسیع بھی کی اور اسے مستحکم بھی کیا۔

رشید حسن خان دسمبر 1925ء میں یوپی کے شہر شاہجہان پور میں پیدا ہوئے، تعلیمی کاغذات میں تاریخ ولادت 30 جنوری 1930ء درج ہے جو غلط ہے۔ ان کے والد امیر حسن خان انگریزی تعلیم کو بڑا سمجھتے تھے اور تحریک عدم تعاون کے دوران انہوں نے پولیس کی ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لی تھی۔ رشید حسن خان نے عربی مدرسہ بحر العلوم میں تعلیم حاصل کی، لیکن گھر کے نامساعد حالات کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ ادھورا چھوڑ کر انہیں 1939ء میں صرف چودہ برس کی عمر میں آرڈیننس فیکٹری شاہجہان پور میں ایک معمولی ورکر کی ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ اس فیکٹری میں 1941ء میں ''مزدور یونین'' بنائی گئی جس نے چند سال کے بعد پہلی ہڑتال کرائی، اس یونین میں رشید حسن خان جائنٹ سیکرٹری تھے۔ لیکن ان کا مزاج ٹریڈ یونین سے مل نہ سکا کیونکہ اس میں مزدوروں کے مسائل حل کرنے سے زیادہ کمیونسٹ آئیڈیالوجی کو پھیلانے کا کام لیا جاتا تھا اور ورکروں کی باقاعدہ ذہنی تربیت جو ''برین واشنگ'' سے موسوم کی جاسکتی ہے، ہوتی تھی۔ رشید حسن خان کے نزدیک ''دنیا کے مزدور ایک ہو جاؤ''..... کھوکھلا نعرہ اور سیاسی ہتھکنڈہ تھا۔

تمام ورکر نچلے درجے سے آئے تھے اور سادہ دل، سچے ایماندار اور نظریے سے مخلص تھے، تمام لیڈر اپر کلاس سے آئے تھے اور ان کے اپنے ذہنی اور عملی تضادات تھے لیکن رشید حسن خان کے ان تصورات کو فیکٹری کی انتظامیہ نے اہمیت نہ دی اور جائنٹ سیکرٹری ہونے کی وجہ سے انہیں 1946ء میں فیکٹری سے نکال دیا گیا۔ اس دوران انہوں نے فارسی، ہندی اور انگریزی پڑھی اور شہر کے مدرسہ فیض عام میں مدرس مقرر ہو گئے۔ اس سے قبل گزر اوقات کے لیے انہوں نے ایک چکی پر منشی کا، ایک زمیندار کے پاس کارندے کا اور پھر راشن کی دکان پر ایک منیم کا کام بھی کیا۔ 1952ء تک وہ یوپی کے عربی فارسی بورڈ سے مولوی کا اور لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیر کامل کا امتحان پاس کر چکے تھے، اس لیے آسانی سے اردو فارسی ٹیچر بن گئے۔ اگست 1959ء میں انہیں دہلی یونیورسٹی میں شعبہ اردو میں ریسرچ اسسٹنٹ کی ملازمت مل گئی جہاں سے 31 دسمبر 1989ء کو ریسرچ ایسوسی ایٹ کی حیثیت سے ریٹائر ہو گئے۔

رشید حسن خان نے ترقی پسند تحریک سے بچنے کی جو وجوہات شمار کی ہیں، ان میں ادب کے مطالعے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ لیکن وہ کمیونسٹ لیڈروں کے عملی رویئے سے بھی مایوس ہو گئے تھے، جن کی انتہا پسندانہ پالیسی نے کام بنانے کی بجائے کاموں کے بگاڑنے کو اپنا نقطہ نظر بنا لیا تھا۔ ان کی رائے میں ''کمیونسٹ پارٹی کا اس وقت یہی اساسی نقطہ نظر تھا۔''

رشید حسن خان کی تربیت میں خاندانی اور نسلی روایات کے علاوہ شاہجہان پور کی تہذیبی فضا، تمدنی روایات اور عوامی عادات نے گراں قدر اثر و عمل ظاہر کیا۔ اس ضمن میں انہوں نے یہ دلچسپ حقیقت خود بیان کی ہے:

''میں دہلی کے مہذب اور شائستہ لوگوں کے ساتھ 36 سال رہا ہوں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس شخص کی اصل رائے کیا ہے؟ اس کے برخلاف آپ میرے چھوٹے سے شہر (شاہ جہان پور) میں چلیے، پانچ منٹ میں معلوم ہو جائے گا کہ کس شخص کی اصل رائے کیا ہے؟'' ان کی رائے میں ''پٹھان مصلحت اندیشی سے عموماً ناآشنا اور

منافقت وریاکاری سے خاصے دور رہا کرتے تھے۔ اکثریت کا احوال یہی تھا۔'' اس ماحولیات نے ہی انہیں تحقیق کی طرف متوجہ کیا اور محمود شیرانی کی تحریریں ان کی اولین رہنما ثابت ہوئیں، بعد میں انہوں نے قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تحریروں سے بھی عرفان حاصل کیا اور تحقیق وتنقید دوٹوک، واضح اور اپنی تحقیق کے مطابق سچی بات بلا رعایت کہنے لگے۔ ان کے نقطہ نظر کے مطابق:

> ''تحقیق کو سچ کی تلاش رہتی ہے۔ جھوٹ کس نے بولا، یہ بھی ایک بات ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ ''جھوٹ کیوں بولا گیا؟ اور کیسے بولا گیا؟''
> اس ''کیوں'' اور ''کیسے'' کی وضاحت بھی تحقیق کا ایک مقصد ہے.....
> میں یہ بھی مانتا ہوں کہ تحقیق کا بڑا مقصد ہے حقائق کی تلاش اور ان سے اخذ نتائج......اور یہ میرا محبوب مشغلہ ہے۔''

رشید حسن خان کی طرف اہل ادب نے 1954ء میں اس وقت چونک کر دیکھا جب انہوں نے فیض احمد فیض کی مقبول شاعری میں زبان وبیان کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ مثلاً فیض کا مصرع ہے:

''جی اٹھے پھر ترا اجڑا ہوا بے نور دماغ''

رشید حسن خان نے اعتراض کیا کہ بے نور دماغ کا جی اٹھنا محل نظر ہے۔ اجڑنے کا متضاد بسنا ہے اور بے نور کا منور۔۔۔ اگر کہا جاتا کہ تیرا بے نور دماغ منور ہو جائے یا تیرا اجڑا ہوا دماغ آباد ہو جائے تو اک بات ہو سکتی تھی۔

رشید حسن خان کشادہ نظر، خوش طبع اور کھلا ذہن رکھنے والے محقق تھے، مجھے ان سے پاکستان میں دو مرتبہ ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ پہلی مرتبہ وہ ''جشن نیاز و نگار'' میں شرکت کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم کے ساتھ تشریف لائے اور نیپا کے مہمان خانے میں ٹھہرائے گئے جہاں ایک گوشے میں میں بھی مقیم تھا، صبح ناشتے پر ملاقات ہوتی تو رات گئے تک وقفوں وقفوں

سے ملنے کا موقع ملتا۔ ڈاکٹر خلیق انجم لطیفوں کی زنبیل تھے۔ وہ ہا موقع لطیفہ سناتے لیکن رشید حسن خان کھل کر قہقہہ لگانے کی بجائے صرف مسکرا دیتے۔ ایک زمانے میں وہ نیاز فتح پوری کے عقیدت مند تھے، اب معتقدانہ انداز ختم ہو چکا تھا لیکن قدر دانی کم نہ ہوئی تھی۔ آل احمد سرور کی تنقید کو انشائیے کے قریب قرار دیتے جوان کے نزدیک منافقانہ انداز بیان تھا، ان کی تنقید بے اثر محسوس ہوتی تھی۔ دوسری ملاقات لاہور میں ڈاکٹر معین الرحمان کے ہاں ہوئی، اس روز وہ ملول تھے کہ پاکستان کے ایک ادیب نے ناسخ کا دیوان ایڈٹ کیا تھا لیکن وہ بتا نہ سکے کہ انہوں نے کس مخطوطے کو اساس کے طور پر استعمال کیا تھا، ان سے ایک مختصر سی ملاقات دہلی یونیورسٹی میں بھی ہوئی لیکن یہ تقریباتی ملاقات تھی، تاہم مجھے یاد ہے کہ انہوں نے میری کتاب ''اردو ادب کی تحریکیں'' میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔ یہ کتاب میں نے انہیں پاکستان سے بھجوائی لیکن ان کی رائے معلوم نہ ہو سکی۔ میں ان کی خاموشی کو بھی اپنا انعام تصور کرتا ہوں۔

رشید حسن خان نمود و نمائش پسند نہیں کرتے تھے، وہ اخبارات کو انٹرویو دینے سے بھی گریز کرتے تھے۔ کراچی میں ان کی ایک عالمانہ گفتگو کو جناب شبنم رومانی نے قلم بند کیا تھا۔ اورنٹیل کالج لاہور کی طالبہ مسرت انیس کے سوالات کے تحریری جواب دیئے، لیکن اس انٹرویو میں پروفیسر رفیع الدین ہاشمی سے ان کی دوستی اور اصرار شامل تھا۔ اس انٹرویو سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاکی ان کا پسندیدہ کھیل تھا، دہلی میں ہاکی کا بڑا ٹورنامنٹ دیکھنے کا موقع ملتا تو بہت خوش ہوتے۔ لپچو اُن کی مرغوب چائے تھی۔ اپنے لیے چائے وہ خود تیار کرتے تھے جسے سبک، خوش رنگ اور وسعت دار کپ میں پیتے تھے۔ آخری عمر میں ان کے معمولات لکھنے پڑھنے تک محدود ہو گئے تھے۔ تقریبات میں عموماً شرکت نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے:

> ''میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے ملنے کے لیے بھی لوگ نہ آئیں، وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ اسی لیے میں نے آج تک ٹیلی فون نہیں لگوایا کہ وقت ضائع ہوگا، لوگ عموماً فضول باتیں کرتے ہیں، غیر ضروری اور دیر تک۔

ذہن سے ساری سوچی سمجھی باتیں نکل جاتی ہیں، اب میرے بڑے صاحبزادے فون لگوانا چاہتے ہیں، میں نے اس شرط پر اتفاق کیا کہ اس کو میرے کمرے سے دور رکھا جائے گا اور مجھے وہاں نہیں بلایا جائے گا جب تک کہ واقعی کوئی اہم بات نہ ہو...... جو بہت کم ہوتی ہے۔''

اس تحریری انٹرویو میں انہوں نے یہ دلچسپ بات بھی لکھی ''میری زندگی گویا رہی ہی نہیں۔ جو عمر عشق کرنے کی ہوتی ہے وہ ٹریڈ یونین کے ہنگاموں میں گزری یا پھر تلاش معاش میں۔''

رشید حسن خان بلاشبہ ایک بڑے ادیب، بڑے محقق اور بڑے انسان تھے۔ ہندوستان میں اردو تحقیق کی روایت بڑی مستحکم ہے، اس روایت کو رشید خان نے اپنے اصولوں پر عمل کرکے تابندگی عطا کی اور دبستان محمود شیرانی کو توانائی بخشی۔ ان کا کام اردو کے ادیبوں کے لیے ہمیشہ ایک منارہ نور ثابت ہوگا اور تاریک ذہنوں کو روشنی فراہم کرے گا۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان

موبائل فون پر میں نے وحید صاحب کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ صبح سویرے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے بول رہے تھے اور دکھ بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ''سہیل صاحب فوت ہوگئے'' ڈاکٹر آغا سہیل کی وفات کی خبر میں پانچ چھ دن قبل سن چکا تھا۔ لاہور کے چند ادیبوں اور ان کے بہت سے عزیزوں کی موجودگی میں انہیں لحد میں اتارا گیا، ان کی مغفرت کی دعا کی گئی، میں نے یہ بات وحید صاحب کو بتائی تو غم زدہ لہجے میں بولے

''انور سدید، ڈاکٹر سہیل احمد خان گزر گئے ہیں۔ جی، سی کے شعبہ اردو کے ڈین (Dean)'' دل کی دھڑکن یک دم تیز ہوگئی۔ رگوں میں خون رکتا محسوس ہوا۔ شیشہء ساعت سے گرتے ہوئے ذروں کی گنتی تو میں نے شروع کر رکھی تھی اور ہر روز اپنا زائچہ خود نکالتا تھا۔ لیکن پیمانہء حیات سہیل احمد خان نے چھلکا دیا۔ ہائے، ہائے، افسوس، صد افسوس، میرے دل کی حسرت مرزا اسد اللہ خان غالب کے ان الفاظ میں ڈھل گئی جو انہوں نے جوانمرگ زین العابدین عارف کی وفات پر کہے تھے۔

''کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور''

لیکن موت کا وقت تو معین ہے اور ہونی کو کون روک سکتا ہے؟ دکھ کی بات یہ ہے کہ سہیل احمد خان کے خون میں کینسر کے جراثیم بہت عرصہ پہلے داخل ہو چکے تھے لیکن ان مہلک جراثیم کا شب خون اس قدر پر اسرار تھا کہ سہیل صاحب کو اس داخلی آزار کی خبر ہی نہ ہونے دی۔ جی سی یونیورسٹی میں کام کر رہے تھے کہ اچانک بے ہوش ہو گئے۔ ہسپتال پہنچانے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہ کی گئی، لیکن کینسر اپنا آخری جاں کاہ وار کر چکا تھا۔ معالجوں کی سب تدبیریں ناکام ہوگئیں تھیں۔ ٹیلی ویژن پر ان کی وفات کی خبر کی پٹی دوڑنے لگی۔ ملک کے جس ادیب نے بھی اس

ساٹھ برس کے جواں سال، فعال، ہمہ تن سرگرم اور تخلیقی اور تنقیدی ادب میں زندگی بسر کرنے اور اپنے طلباء و طالبات میں ادب کا اعلیٰ ذوق پیدا کرنے والے شخص کی وفات کی خبر سنی، بے اختیار رو دیا۔ سہیل احمد خان نے اپنی جوانی میں ایک ایسے عالم کا درجہ حاصل کر لیا تھا جس کی موت پر پورا عالم تاریک ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان میرے دوستوں میں سے نہیں تھے۔ میں ان کی خیال انگیز فکری تحریروں کا قاری تھا، ادبی تقریبات میں ان سے ملاقاتیں بھی ہوتی تھیں لیکن قربت کے لمحات اور ادبی موضوعات پر تبادلہء خیال کے مواقع کم کم نصیب ہوئے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اچھی کتاب میں ان کی دلچسپی بڑی گہری تھی اور انہیں اعلیٰ پائے کا ادب تخلیق کرنے والوں کی صحبت نصیب ہوئی تھی۔ ان میں محمد حسن عسکری، ناصر کاظمی، مظفر علی سید، انتظار حسین، محمد سلیم الرحمان، صلاح الدین محمود، مسعود اشعر، رحمان مذنب، شہزاد احمد، جیلانی کامران، صلاح الدین عادل، حنیف رامے، احمد مشتاق، ظہیر کاشمیری، سجاد باقر رضوی اور اس دور کے وہ سب ادیب اور دانشور شامل تھے جن کی شام پاک ٹی ہاؤس میں گذرتی تھی اور جو حلقہ احباب ذوق کے جلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوئے تھے اور اپنی صحت مند تنقید سے نئے لکھنے والوں کی تربیت کرتے تھے۔ سہیل احمد خان کی ادبی تربیت میں اولاً اورینٹل کالج لاہور کے اساتذہ ڈاکٹر سید عبداللہ، سید وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر وحید قریشی نے مثبت کردار ادا کیا تھا۔ ثانیاً ان کے ذوق کو حلقہ ارباب ذوق نے سنوارا تھا۔ تاہم میرا اندازہ ہے کہ وہ 1960ء کی دہائی میں ایک نقاد کی حیثیت میں سامنے آئے تو وہ محمد حسن عسکری سے زیادہ متاثر تھے، پاک ٹی ہاؤس میں ایک میز انتظار حسین، مظفر علی سید اور سہیل احمد خان کے لیے مخصوص تھی، کسی ادبی نقطے پر بحث ان تینوں میں ہوتی، دوسرے ادیب اس مجلس میں شامل ہوتے تو ان کی حیثیت سامعین کی ہوتی۔ استثنیٰ ڈاکٹر وزیر آغا کو حاصل تھا کہ سرگودھا سے آتے اور ٹی ہاؤس میں داخل ہوتے تو سہیل احمد خان انہیں اپنی میز پر لے جاتے اور اس روز ادبی بحث کا تنوع دیدنی ہوتا۔ ٹی ہاؤس کے بہت سے

پرندے اڑ کر اس میز پر آ جاتے اور ان سب کی باتیں غور سے سنتے رہتے۔

اب مجھے سہیل احمد خان سے اپنی پہلی ملاقات یاد آ رہی ہے۔ میں ایم اے کی ڈگری لینے کے لیے پنجاب یونیورسٹی کے ''کانووکیشن'' میں لاہور آیا تھا۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کے چانسلر پروفیسر حمید احمد خان تھے اور یہ ان کا پہلا جلسہ تقسیم اسناد تھا، جس کی صدارت کے لیے انہوں نے ممتاز حسن صاحب کو مدعو کیا تھا۔ حمید احمد خان صاحب نے پنجاب یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ خطبۂ استقبالیہ اردو میں پڑھا تھا۔ جلسے کی تمام کارروائی اُردو میں ہوئی اور ممتاز حسن خان کا صدارتی خطاب بھی اردو میں تھا۔ ایم اے اردو میں اول آنے پر مجھے طلائی تمغہ عطا کیا گیا تھا، چائے کی میز پر ایم اے اردو کے طلبا اور طالبات میرے گرد جمع ہو گئیں اور وجہ شاید یہ تھی کہ میں نے پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت میں شرکت کی تھی اور یہ پہلی دفعہ تھی کہ یونیورسٹی کے داخلی طالب علم کی بجائے خارجی طالب علم اول آیا تھا۔ میں ان دنوں ماہنامہ ''اردو زبان'' سرگودھا کا پس پردہ مدیر تھا جس میں ڈاکٹر وزیر آغا کی نئی کتاب ''اردو شاعری کا مزاج'' کا اشتہار چھپتا تو اس کے ساتھ یہ الفاظ بھی شامل ہوتے کہ:

''اس کتاب کو پڑھ کر طلبہ ایم اے میں اول آتے ہیں۔''

سہیل احمد خان ان دنوں اورینٹل کالج کے طالب علم تھے اور سال دوم میں تھے۔ میں انہیں جانتا نہیں تھا، ان کا نام تو بعد میں معروف ہوا۔ اتنا یاد ہے کہ ایک دبلے پتلے سانولے سے نوجوان جس نے ''ہاکی اسٹک'' (Hockey Stick) الٹی پکڑی ہوئی تھی، اس جملے کو انتہائی مبالغہ آمیز اور دوسرے اعلیٰ پائے کے مصنفین کی حق تلفی قرار دیا۔ میں نے سادہ جواب دیا

''ایک زندہ مثال تو آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ مجھے ''اردو شاعری کا مزاج'' نے تنقیدی بحث کا سلیقہ سکھایا ہے۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ سہیل احمد خان نے اس جواب کو خندہ پیشانی سے قبول نہیں کیا تھا لیکن جب کچھ عرصے کے بعد ادب میں ان کی نمود ایک دھماکے سے ہوئی اور میں ان کے

کارناموں کی تعریف سے گریز نہ کرتا اور سالانہ ادبی جائزوں میں ان کا تذکرہ تفصیل سے کرتا تو وہ میری قدر افزائی کرنے لگے اور ایم اے کی نئی جماعت داخل ہوئی تو اسے ''اردو ادب کی تحریکیں'' کے مطالعے کی تلقین بھی کرتے۔

سہیل احمد خان کے والد سرکاری ملازم تھے ان کا بچپن پنجاب کے چھوٹے شہروں مثلاً بورے والا، پاک پتن، ساہی وال اور عارف والا میں گزرا۔ ایف اے ایمرسن کالج ملتان سے کیا۔ بی اے کے آخری سال میں فیصل آباد گئے۔ 1966ء میں ایم اے اردو کرنے کے لیے لاہور میں یونیورسٹی اورینٹل کالج میں داخلہ لے لیا۔ ادبی حلقوں میں اٹھنے بیٹھنے اور سینئر ادیبوں کی باتیں غور سے سننے کی عادت ملتان میں مستحکم ہوئی لیکن مطالعے کا شوق بچپن سے تھا، اس کو واضح صورت کالج میں آ کر اس وقت ملی جب انٹر کالجیٹ مشاعروں میں وہ ایمرسن کالج کی نمائندگی کرتے تھے اور ان کی غزل ٹرافی جیت لاتی تھی۔ رائٹرز گلڈ ملتان میں انہیں عرش صدیقی، مسعود اشعر، منو بھائی اور اسلم انصاری اور فیصل آباد میں افتخار نسیم، ریاض مجید، ، انور محمود خالد اور سلیم بیتاب سے ملنے کے مواقع ملے۔ تنقید کے لیے پہلی نظم رائٹرز گلڈ ملتان کے ایک جلسے میں پیش کی۔ لاہور میں ان کی سب سے زیادہ ادبی راہنمائی سجاد باقر رضوی نے کی جو اورینٹل کالج میں ان کے استاد تھے اور ان سے میرا جی کے حوالے سے پہلا تنقیدی مضمون لکھوایا تھا۔ انتظار حسین نے انگریزی اخبار ''ڈان'' میں 27 مارچ 2009ء کو جو کالم لکھا وہ ایک دوست کی رحلت کا نوحہ بھی ہے لیکن درحقیقت یہ ایک رخشندہ ادیب اور گہری نظر رکھنے والے نقاد کا مرثیہ ہے۔ اور انہیں ملال یہ بھی ہے کہ اورینٹل کالج اور جی سی یونیورسٹی کی سرکاری ملازمت کی ذمہ داریوں نے ہمیں ایک ایسے ادیب سے محروم کر دیا جس کے فن کے جتنے زاویے سامنے آئے ہیں وہ سب متاثر کرتے ہیں لیکن ان کے وسیع مطالعے کے بہت سے ثمرات ابھی سامنے نہیں آئے تھے کہ ان کا بیشتر وقت سرکاری ذمہ داریوں اور فرائض ادا کرنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ دوسری طرف یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ دن کی تمام مصروفیات کے باوجود ان کی رات اپنی دسترس میں تھی

اور اسکا بیشتر حصہ وہ مطالعے میں صرف کرتے تھے۔ کار منصبی کو فوقیت دینے کی وجہ سے انہوں نے ادبی تقریبات میں شرکت اپنی مرضی سے موقوف کردی تھی اور اس لحاظ سے یہ گوشہ نشینی ہی تھی جو خود اختیاری تھی۔ لیکن اگر کسی تقریب کے منتظمین زیادہ اصرار کرتے تو سہیل صاحب زبانی اظہار خیال کے لیے تشریف لے آتے اور ان کی جامع فی البدیہہ تقریر اس تقریب کا حاصل شمار ہوتی ۔۔اب مجھے ان کی دو تقریریں یاد آ رہی ہیں جن کی صدائے بازگشت لمبے عرصے تک لاہور کے ادبی حلقوں میں گونجتی رہی۔ انہوں نے پہلی تقریر قائداعظم لائبریری کے رسالہ ''مخزن'' کی ''قومی اردو کانفرنس'' میں مارچ 2007ء میں کی۔ اس کانفرنس میں شہزاد احمد، محسن احسان، خاطر غزنوی، مہتاب راشدی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر عطش درانی، ظہیر الحسن اور انور سدید نے لکھے ہوئے مقالات کی تلخیص پیش کی۔ لیکن ڈاکٹر سہیل احمد خان آخری اجلاس کے آخری لمحات میں آئے اور پاکستان میں اردو کے مستقبل کے بارے میں جو خیال انگیز تقریر کی اس میں انگریزی زبان کی بالادستی کے خلاف واضح احتجاج موجود تھا۔ ان کا بنیادی موقف یہ تھا کہ انگریزی کی سرکاری سرپرستی اور پرائمری درجے سے آغاز کے باوجود انگریزی زبان کو فروغ عام حاصل نہیں ہوسکتا لیکن سب سے زیادہ نقصان قومی زبان اردو کو ہو رہا ہے جو چاروں صوبوں کے رابطے کی زبان اور قومی یکجہتی کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ اس کانفرنس کا ذکر قومی اخبارات میں ہوا تو ڈاکٹر سہیل احمد خان کے نقطہ نظر کو اداریوں میں سراہا گیا۔

مجھے ان کی دوسری تقریر گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں ڈاکٹر وحید قریشی کی تقریب پذیرائی میں سننے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی لائبریری جو کم و بیش تیس ہزار تحقیقی و تنقیدی و تخلیقی کتب اور نایاب مخطوطات اور قیمتی تراشہ جات پر مشتمل تھی گورنمنٹ کالج کو تحفتاً پیش کردی تھی۔ اس تقریب میں مقررین نے بالعموم ڈاکٹر وحید قریشی کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کا تذکرہ کیا لیکن سہیل احمد خان نے تحقیق کی اس روایت کی تاریخ پیش کی جس کو اورینٹل کالج لاہور میں حافظ محمود شیرانی نے پروان چڑھایا تھا اور جس کی 2007ء میں نمائندگی ڈاکٹر وحید قریشی

کر رہے تھے۔ اس تقریب کے بعد مجھے ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ کار میں ان کے گھر تک سفر کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ راستے میں مقررین کا ذکر آیا تو انہوں نے سہیل احمد خان کو سب سے زیادہ داد دی کہ انہوں نے شخصی اوصاف کے برعکس انہیں محمود شیرانی کی تحقیق کی روایت سے منسلک کیا تھا۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ اعلیٰ پائے کی گفتار رزق ہوا بن گئی اور اب کسی ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔

سہیل احمد خان نے اپنے ادب کا آغاز غزل سے کیا تھا۔ کالج کے زمانے میں بین الکلیاتی مشاعروں میں انہیں کامیابی بھی حاصل ہوئی لیکن میرا جی، راشد، فیض، مجید امجد اور منیر نیازی کے گہرے مطالعے نے انہیں جدید نظم کی طرف راغب کیا، انہوں نے عالمی ادب کے مشاہیر میں سے ٹی ایس ایلیٹ، ایذرا پاؤنڈ اور رلکے کا مطالعہ کیا تو ان کے اثرات بھی قبول کیے اور جدید اردو نظم میں اپنا رنگ و آہنگ قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی، ان کی شاعری کی دو کتابیں ''ایک موسم کے پرندے'' اور ''روح کی نشانیاں'' انہیں جدید نظم کی تاریخ میں زندہ رکھیں گی۔ ڈاکٹر محمد اجمل سے تعلق خاطر نے انہیں نفسیات کے مطالعے کی طرف راغب کیا اور انہوں نے صرف فرائیڈ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ژنگ کے مطالعے میں زیادہ دلچسپی لی اور جدید نفسیات کی روشنی میں اردو داستانوں کی نئی علامتی تعبیر کی، ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع بھی یہی تھا جس کا کچھ حصہ کتابی صورت میں ''اردو داستانوں کی علامتی کائنات'' کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ ان کی تنقیدی کتابوں میں ''طرفیں''۔۔۔ ''طرزیں'' اور ''سرچشمے'' بہت معروف ہیں۔ تالیفات میں ''داستاں اور داستاں'' اور ''مقالات حلقہ ارباب ذوق'' شامل ہیں۔ سہیل احمد خان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ معاصر ادب کو متعارف کرانے میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے انہوں نے اورینٹل کالج سے ایک رسالہ ''لفظ'' جاری کیا۔ ''محراب'' کے نام سے معاصر ادب کا کتابی سلسلہ شروع کیا جس کے آخری دور میں احمد مشتاق ان کے معاون تھے۔ قوسین کے رسالہ ''سویرا'' میں انہوں نے محمد سلیم الرحمان کی معاونت ادارت میں کی۔ وہ دو مرتبہ

حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری منتخب ہوئے اور ان دو برسوں میں اعلیٰ معیار کے تنقیدی اجلاس منعقد کیے کہ میراجی کے دور کی یادیں تازہ ہوگئیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ اب وہ افسانے کی طرف بھی آگئے تھے۔ان کا ایک افسانہ ''سویرا'' میں شائع ہوا ہے۔

سہیل احمد خان ادب کے ادبی متنازعات میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ لیکن وہ اپنی غیر جانبدارانہ رائے خود قائم کرتے تھے اور اس کے آزادانہ اظہار سے گریز بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ مظفر علی سید اور ڈاکٹر وزیر آغا کو صحیح نقاد شمار کرتے تھے کیونکہ انہوں نے معاصر ادب سے اپنا زندہ رشتہ استوار کیا تھا۔ڈاکٹر سلیم اختر اور تحسین فراقی کو مدرس نقاد کہا تو ان کے ساتھ اپنا نام بھی شامل کر دیا۔انہوں نے احتشام حسین، محمد حسن عسکری، فراق گورکھپوری کو اردو کے اہم نقاد شمار کیا اور تسلیم کیا کہ ان کا ذاتی جھکاؤ محمد حسن عسکری کی طرف ہے۔۔۔سہیل احمد خان ایک طویل عرصہ جاپان میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد پاکستان واپس آئے تو خوش تھے کہ وہ جدید ادب کی کتابوں کی ایک پوری لائبریری خرید لائے تھے اور اب گھر پر مطالعہ کر سکیں گے۔سرکاری لائبریریوں سے کتابیں مستعار لینے کی ضرورت نہ ہوگی۔لیکن موت نے انہیں زیادہ مہلت نہ دی کہ مطالعے کی یہ مسرت حاصل کر سکیں اور اچانک دنیا سے اٹھ گئے اور سفر ناتمام رہا۔
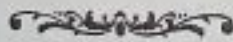
شفیع عقیل

شفیع عقیل نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کراچی میں گذارا جو ابتداء میں ساحل سمندر پر مچھیروں کی ایک بستی تھی لیکن آزادی کے بعد جب اس ارتقاپذیر بستی کو نومولو د پاکستان کا دارالحکومت بنادیا گیا تو اس کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا اور نہ صرف ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا وطن بنالیا بلکہ پاکستان کے دوسرے صوبوں کے لوگ بھی کراچی کی طرف کھنچے چلے آنے لگے کہ حکومت کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے اس کی صنعتی، تجارتی، تہذیبی، علمی اور ادبی ترقی کی رفتار بھی تیز ہوگئی تھی۔ لاہور سے جو لوگ تلاش معاش کے لیے کراچی آئے، ان میں بیس بائیس برس کا ایک نوجوان محمد شفیع تھا جس نے قرآن ناظرہ لاہور کے ایک نواحی گاؤں تھینہ کی مسجد میں پڑھا تھا اور پھر سکول میں تعلیم حاصل کرنے کی بجائے غربت کی وجہ سے اپنے والد کا ہاتھ راج گیری میں بٹانے لگا تھا۔

قرآن کریم پڑھتے ہوئے اس کے باطن میں جستجوئے علم کا جذبہ فروزاں ہوگیا تو اس نے اپنے داخلی ذوق کی اساس پر اُردو کی کتابیں پڑھنی شروع کردیں۔ دن بھر کی محنت کے بعد رات کو گھر آتا تو شہر کی ایک دکان سے کہانیوں کی کتابیں ایک آنہ روز کے کرائے پر لے آتا اور چراغ کی روشنی میں ایک دو کتابیں ختم کر کے سوتا۔ اس دوران میں ہی اس نے سرکنڈے کی قلم سے لکڑی کی تختی پر لکھنے کی مشق کرلی اور اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہوگیا کہ وہ خود بھی کہانیاں لکھ سکتا ہے۔ چنانچہ اب اس کے باطن سے جو ادیب بیدار ہوا اس کا نام اس نے خود شفیع عقیل رکھا اور کہانیوں کا یہ راوی وسیلۂ رزق میں وسعت پیدا کرنے کے لیے کراچی پہنچا تو اس کی ملاقات اس دور کے ایک ممتاز مزاح نگار صحافی مجید لاہوری سے ہوگئی جسے اپنے رسالہ ''نمکدان'' کا اضافی کام کرنے کے لیے ایک ملازم کی ضرورت تھی۔ شفیع عقیل نے یہ ملازمت اس لیے قبول

کر لی کہ یہ اس کے ادبی ذوق کے مطابق تھی اور مجید لاہوری نے شفیع عقیل کو اپنا معاون اس لیے بنالیا کہ وہ اپنے محسن کو پہچانتا تھا اور ''نمکدان'' کا ہر کام پوری لگن سے انجام دیتا تھا۔

اگرچہ کراچی آنے سے پہلے وہ 1947ء کے فسادات پر افسانوں کی ایک کتاب ''خون ہی خون'' کے نام سے لکھ چکا تھا لیکن اس کی حقیقی ادبی تربیت رسالہ ''نمکدان'' کے گہوارے ہی میں ہوئی۔ شفیع عقیل ہمیشہ تسلیم کرتے کہ انہیں مجید لاہوری نے مختلف موضوعات کی کتابیں پڑھنے کی نہ صرف تلقین کی بلکہ کتاب کے مطالعہ کے بعد اس پر لکھنے کا مشورہ بھی دیا اور یہ سبق بھی دیا کہ ''اپنی بات اپنے لہجے میں جرات مندی سے کہو''۔ شفیع عقیل کی مزاح نگاری کا جوہر بھی مجید لاہوری ہی کی دریافت تھی جس کو اس نے ''نمکدان'' کے کالموں میں خوب استعمال کیا اور پھر ان کالموں کی بنیاد پر ہی میر خلیل الرحمان نے اسے اپنے اخبار روزنامہ ''جنگ'' میں ملازمت دے دی اور یہ ملازمت شفیع عقیل نے 63 برس تک شجر سے پیوستہ رہ کر انجام دی۔ اس کی وفات کے وقت کراچی کی آبادی دو کروڑ کے لگ بھگ ہوگئی تھی لیکن شفیع عقیل اس دھرتی پر اکیلا انسان تھا جو دنیا کے دکھ سہہ رہا تھا اور انسانیت کا زوال دیکھ رہا تھا۔

شفیع عقیل کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ اس نے مدرسے کا منہ نہیں دیکھا، اس نے کالج کی تعلیم حاصل نہیں کی اور اس کے پاس کسی یونیورسٹی کی ڈگری نہیں ہے لیکن اسے اپنی برتری کا یہ احساس بھی تھا کہ وہ تلمیذ الرحمان ہے اور ادب کے سلسلے میں فطرت خود اس کی رہنمائی کر رہی ہے۔ اس نے اخبار کی ملازمت میں اپنے قلم پر پورا عبور حاصل کیا اور الفاظ کی دولت اس طرح جمع کی جس طرح کوئی صنعت کار سرمایہ جمع کرتا ہے۔ شفیع عقیل کی عملی زندگی میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ علم اپنی جستجو سے حاصل ہوتا ہے اور دنیا کے کامیاب لوگوں کی زندگی کا مطالعہ اور ان کی مجالس میں حاضری سے ذہن کشادہ ہوتا ہے اور اظہار کے در کھلتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات غیر معمولی ہے کہ شفیع عقیل نے صحافت کی دنیا میں ترقی کے زینے پر اس وقت قدم رکھا جب صحافت کے افق پر مولانا ظفر علی خان، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، اطہر امرتسری،

مرتضیٰ احمد خان میکش، حمید نظامی اور چراغ حسن حسرت جیسے روشن ستارے تاباں تھے۔ شفیع عقیل نے ان سب کی صحافت کا مطالعہ کیا اور رموز صحافت اخذ کر کے جزو جان بنا لیے۔ اس دور کے مشاہیر میں سے حفیظ جالندھری، عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت نے کچھ وقت کراچی میں گزارا تو شفیع عقیل نے ان سے عقیدت مندی کا اظہار کیا اور ان سے رسمی اور غیر رسمی ملاقاتوں کے نقوش اپنی لوح دل پر ثبت کر لیے۔ یہ نقوش شفیع عقیل کی خاکہ نگاری میں نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔

کراچی میں قیام کے دوران ہی شفیع عقیل کو مصوری سے دلچسپی پیدا ہوئی، اس نے آذر زوبی، صادقین، زبیدہ آغا، جمیل نقش، انور جلال شمزا، گل جی اور اقبال مہدی جیسے مصوروں کو ان کے نگار خانوں میں کام کرتے ہوئے دیکھا۔ ان کے فن کو سمجھنے کے لیے مغرب کے نامور مصوروں پر لکھی گئی کتابیں پڑھیں اور بعض عالمی سطح کی مشہور تصویروں پر ان مصوروں کے ساتھ بحث و مباحثہ کیا۔ شفیع عقیل کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے متذکرہ مصوروں کے فن اور شخصیت پر طویل مضامین لکھے اور ان پر کتابیں بھی شائع کیں۔ اہم بات یہ ہے کہ شفیع عقیل نے اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ ادب کا جوہر فطرت عطا کرتی ہے لیکن اسے بازیافت کرنے اور سنوارنے کا فریضہ معاشرے کے تجربہ کار افراد انجام دیتے ہیں اس نے خود بھی روایتی تعلیم کی کمی کو اپنے راستے کی رکاوٹ نہیں بننے دیا اور جب فن پر دسترس حاصل کر لی تو اپنا دست کرم کشادہ کر دیا۔

اس کی وفات کے بعد ممتاز افسانہ نگار نجم الحسن رضوی نے تسلیم کیا کہ شفیع عقیل نے کم سن ادیبوں اور شاعروں کے لیے ایک تخلیقی ''انکیوبیٹر'' کا انتہائی حیرت ناک کام انجام دیا۔ ''نونہال لیگ'' کے نام سے ایک ادبی انجمن بنائی جس میں کم عمر لکھنے والے شریک ہوتے، اپنی نوخیز تخلیقات پیش کرتے اور صدارت کے لیے اس دور کے کسی ممتاز ادیب کو مدعو کیا جاتا جو بچوں کے سامنے اپنے تخلیقی اور تحریری عمل کے تجربات بیان کرتے اور یوں انہیں علم کا اعتماد عطا کر دیتے۔

اس ''نونہال لیگ'' نے اردو ادب کو جو ممتاز ادیب عطا کیے ان کی تعداد انگلیوں پر نہیں گنی جا سکتی۔ ان میں عبید اللہ علیم، نسیم درانی، افسر آذر، حسینہ معین، جسٹس (ر) سجاد علی شاہ، غازی صلاح الدین، رضا علی عابدی، نعیم آروی، خالدہ شفیع، نجم الحسن رضوی، تسلیم الٰہی زلفی، جسٹس (ر) بھگوان داس، رشیدہ رضویہ، محمد عمر میمن، قمر علی عباسی، انوار احمد زئی، انور شعور، محسن بھوپالی اور بے شمار دوسرے لوگ شامل ہیں جو آج ادب کے تابندہ ستارے ہیں۔ شفیع عقیل نے نئے لکھنے والوں کے لیے ایک رسالہ ''بھائی جان'' بھی نکالا تھا اور نسیم درانی نے رسالہ ''سیپ'' جاری کرنے کا منصوبہ بنایا تو اس کی نہ صرف اعانت کی بلکہ اسے نئے لکھنے والوں کا رسالہ قرار دیا جس میں سینئر ادبا کو بھی جگہ دی جاتی تھی۔ نسیم درانی کا رسالہ ''سیپ'' اب ''فکر نو'' کا ترجمان شمار ہوتا ہے اور اس کے لکھنے والے اردو ادب کی ثروت مندی میں معاون ہیں۔ بالفاظ دیگر اردو ادب پر یہ شفیع عقیل کا بالواسطہ احسان ہے۔ جناب نسیم درانی نے اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا ہے:

> ''شفیع عقیل پچاس اور ساٹھ کی دہائی کے نوعمر ادیبوں اور شاعروں کے لیے ایک ادبی نرسری کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک برگد کا گھنا سایہ تھا جس میں یہ ادیب اور شاعر خود اپنی تخلیقی آنچ کی تمازت سے گھبرا کر پناہ حاصل کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی جوانی سے بڑھاپے تک اس پورے دور کو اپنے سے کم عمر کے لوگوں کی پروجیکشن میں قربان کر دیا۔''
>
> (سیپ، شمار 50، ص 203)

شفیع عقیل کی ایک منفرد عطا یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ماں بولی پنجابی کے عظیم شعراء کو اردو کے طبقے میں مقبول بنایا۔ ان کی کتاب ''پنجابی کے پانچ قدیم شاعر'' میں سید ہاشم شاہ، خواجہ غلام فرید، میاں محمد بخش، شاہ حسین اور حامد شاہ عباسی کا تذکرہ، تنقید، تحسین اور تبصرے کے انداز میں کیا گیا ہے۔ ابتداء میں ایک جامع مقالے میں ''پنجابی زبان اور ادب'' کے نام سے ایک سیر حاصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جمیل الدین عالی نے ''حرفے چند'' میں لکھا ہے:

''شفیع عقیل نے نہایت عمدگی سے پنجابی زبان اور ادب کی تاریخ بیان کی ہے۔اس موضوع پر اُردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقالہ ہے۔جس میں اختصار اور جامعیت دونوں کا خیال رکھا گیا ہے۔''

شفیع عقیل یاروں کا یار اور دشمنوں کا دوست تھا۔ لاہور آتا تو اظہر جاوید کو ملے بغیر واپس نہ جاتا۔ ٹیلی فون پر پوچھتا ''اظہر جی، فٹ ہوناں''۔ ''فٹ ہو'' ان کا تکیہ کلام تھا۔اس نے نامور ادیبوں اور مصوروں پر خاکے ''تخلیق'' میں ہی لکھے تھے، جو اظہر جاوید کے مرتبہ آخری پرچے تک قسط وار شائع ہوتے رہے۔ دراصل اظہر جاوید کی کوشش ہوتی تھی کہ ''تخلیق'' کے ہر شمارے میں شفیع عقیل کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ان کی ادبی خدمات میں سونان اظہر جاوید نے ''تخلیق ایوارڈ'' جاری کیا تو پہلا ایوارڈ شفیع عقیل کو پیش کیا۔ شفیع عقیل نے بڑی سادگی سے سوال کیا:

''میں نے تو اب تک کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔''

اور پھر خود ہی جواب دیا۔

''یہ اظہر جاوید مرحوم سے دوستی کا ثمر ہے۔''

سونان مجھے بتا رہے تھے ''یہ ایوارڈ اظہر جاوید کی دوسری برسی پر ایک تقریب میں 14 فروری 2014ء کو پیش کیا جانا تھا لیکن شفیع عقیل پہلے ہی رخت حیات سمیٹ گئے۔اب ان کے بغیر ''تخلیق'' کی محفل ادب سونی نظر آئے گی۔'' یہ کہتے ہوئے سونان کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

شبنم شکیل

شبنم شکیل اردو کی وہ منفرد ادیبہ تھیں جن کے والد سید عابد علی عابد کا شمار اردو ادب کے معماروں میں ہوتا تھا اور ان کی والدہ محترمہ بلقیس عابد علی بھی قلم کار تھیں اور کوئین میری کالج سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد تالیف وتصنیف کی طرف آئیں تو افسانہ نگاری میں نام پیدا کیا۔ ان کے افسانے اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے رسالے ''داستان گو'' میں چھپتے تھے۔ افسانوں کا مجموعہ ''تیسری عورت'' آغا امیر حسین کے ممتاز اشاعتی ادارے ''کلاسیک'' لاہور نے شائع کیا۔ شبنم 12 مارچ 1942ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں تو عابد علی عابد دیال سنگھ کالج لاہور میں فارسی زبان وادب کے لیکچرار تھے لیکن ادب کے افق پر وہ ایک قطبی ستارے کی طرح جگمگا رہے تھے۔ ادب کی تین اصناف شاعری، افسانہ نگاری اور ڈرامے میں ان کی شہرت نصف النہار تک پہنچ چکی تھی اور تحقیق وتنقید کے علاوہ ادبی رسائل کی ادارت نے اس میں چوکھا رنگ بھرا تھا اور یہ کہنا درست ہوگا کہ شبنم کی تربیت اپنی چھ بہنوں طلعت، نگہت، نزہت، یاسمین، شمع اور شیریں کے ساتھ ادب کے گہوارے میں ہوئی لیکن ادب کی تخلیقی صلاحیت اور جمالیاتی ذوق کا ورثہ صرف شبنم نے سنبھالا۔

جامعہ پنجاب سے ایم اے (اُردو) کرنے کے بعد انہوں نے بھی عابد صاحب کی طرح اپنی عملی زندگی میں درس وتدریس کو فوقیت دی اور کوئین میری کالج سے ملازمت کا آغاز کیا اور کوئٹہ، اسلام آباد کی درس گاہوں میں خدمات انجام دینے کے بعد قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ 1967ء میں ان کی شادی پاکستان سول سروس کے ایک اعلیٰ افسر جناب شکیل احمد سے ہوگئی تو وہ شبنم عابد علی سے شبنم شکیل بن گئیں اور اسی نام سے ادب کی دنیا میں ان کا سکہ چلتا رہا۔ شکیل صاحب سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے تو اسلام آباد میں مستقل طور پر آباد ہوگئے۔ اس تمام

عرصے میں شبنم شکیل نے ایک سلیقہ مند ، خنک مزاج اور شائستہ طبع خانہ دار خاتون کے فرائض انجام دیئے۔ اپنے دو بیٹوں وقار حسین احمد اور جہاں زیب احمد اور بیٹی ملاحت کی تربیت کی۔ انہیں پاکستان کا ذمہ دار شہری بنایا اور معاشرے میں معزز مقام حاصل کرنے میں معاونت کی لیکن زندگی کی اس بھرپور مصروفیت میں ادب کے تخلیقی فرائض سے بھی غفلت نہیں برتی۔

شبنم شکیل بنیادی طور پر شاعرہ تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ادب کے ہمہ جہت مطالعے اور اپنے گردوپیش کے مشاہدے کو اہمیت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ادبی مزاج میں تنقید وتجزیہ کا خصوصی عنصر بھی پیدا ہو گیا اور ان کے تنقیدی مضامین کی پہلی کتاب 1965ء میں شائع ہوئی لیکن شاعری کا پہلا مجموعہ ''شب زاد'' کے عنوان سے 1987ء میں چھپا۔ ''اضطراب'' کے نام سے دوسرا مجموعہ 1995ء میں منظر عام پر آیا۔ شبنم شکیل کی خوبی یہ تھی کہ وہ ادب کے منظر سے کبھی غائب نہیں ہوتی تھیں۔ ملک کے ممتاز ادبی رسائل میں ان کی تخلیقات باقاعدگی سے چھپتی تھیں۔ مجلس آرائی کا سلیقہ انہیں اپنے ماں باپ سے ملا تھا جسے شبنم شکیل نے نئے دور کے تقاضوں کے مطابق آراستہ کیا اور ربط و تعلق کو قائم رکھنے کے لیے سلیقہ مندی سے کام لیا۔ بلاشبہ وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی اور ایک اعلیٰ افسر کی بیگم تھیں لیکن انہوں نے ادب میں اپنا حوالہ اپنی تخلیقات سے قائم کیا اور تمغہ حسن کارکردگی حاصل کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے عابد علی عابد اور شکیل احمد کے نام کو اپنی شہرت کا وسیلہ نہیں بنایا۔ بلکہ اپنی ادبی عظمت کا مدار اپنے تخلیقی خطوط سے استوار کیا اور اسے استحکام اپنے ذوق کی بلندی سے دیا۔ بلاشبہ عابد علی عابد ان کے لاشعور میں اور شکیل احمد ان کے شعور میں ہمیشہ موجود رہے لیکن اپنی نسوانی فطرت کی جمالیات کو والد کی ادیبانہ اور شوہر کی افسرانہ شان وشوکت سے متاثر نہیں ہونے دیا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ شبنم کا ادب خود ان کی تخلیقی جہت کا نمائندہ تھا اور ان کی زندگی کے زاویے بھی ان کے اپنے تراشے ہوئے تھے۔ یہاں عابد علی عابد کی تحسین اس لیے ضروری ہے کہ انہوں نے شبنم کے سن شعور سے اپنی وفات تک ان کی تربیت صحت مند مشرقی خطوط پر کی لیکن ان کے ذہنی ارتقاء کو لالہ خودرو کی طرح بڑھنے کا موقع

دیا۔ دوسری طرف ان کے شوہر بیوروکریٹ شکیل احمد بھی ان کی ادبی آزادی اور تخلیقی لگن میں حائل نہیں ہوئے۔ حالانکہ وہ خود ادیب، شاعر یا تخلیق کار نہیں تھے اور شبنم کی شہرت کے سامنے ان کی شخصیت کا آفتاب ماند پڑ جاتا تھا۔

اہم بات یہ ہے کہ شبنم شکیل کی شاعری کے دور میں ان کی معاصر کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض نے اپنی صنفی حیثیت کو قبول کر لینے کے باوجود ماورائے جنس مرد کے منطقی رویئے کی ساخت شکنی شروع کر رکھی تھی تو دوسری طرف پروین شاکر نے جسم کے داخلی تقاضوں کی فطری تکمیل کے لیے عورت کی منفعل حیثیت کو قبول کر رکھا تھا۔ شبنم شکیل نے ان دو انتہاؤں کے درمیان سے اپنا راستہ نکالا اور ایسی شاعری کی جو صنفی تصادم سے ماورا فطری حقیقت کی نمائندگی کرتی اور احساس اور جذبے کی سچی ترجمان بھی نظر آتی ہے۔ شاعرہ اپنی ذات کو بے نقاب کر رہی ہے تو اشعار کے باطن سے زمانہ بھی اپنا جلوہ ظاہر کر رہا ہے۔ شبنم شکیل متنوع موضوعات کی شاعرہ ہے۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں:

اس نمائش کے تو خاکے ہیں ادھورے سارے اب مکمل کوئی تصویر دکھا دے مجھ کو

ہوئے تھے راکھ تو کچھ راستہ ہی ایسا تھا دبی تھی آگ زمیں میں، جدھر گئے تھے ہم

شب شعلہ بداماں تو سحر سوختہ ساماں دو رُوپ بدلتا تھا عجب وہ بھی دیا تھا

بھولا نہیں وہ ظلم کہ شبنم سر فرات آتش کو آب، دشت کو دریا لکھا گیا

ہاتھ نہ آئی دنیا بھی اور عشق میں بھی گمنام رہے سوچ کے اب شرمندہ ہیں، کیوں دونوں میں ناکام رہے

جب صبح ہوئی دیکھا تو ہر گھر تھا سلامت اک میرا ہی گھر تھا، جہاں شب خون پڑا تھا

شبنم شکیل کی افسانہ نگاری اور تنقید کا اجمالی ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان کی ایک اور انفرادی خوبی کلاسیکی موسیقی اور راگ راگنیوں میں دلچسپی تھی۔ شاعروں، افسانہ نگاروں اور دانشوروں کے علاوہ انہوں نے ملک کے نامور مغنیوں اور موسیقاروں کے فن سے شناسائی بھی پیدا کی اور ادبی رسائل میں ان کے شخصیت نامے بھی لکھے۔ میں نے ان کا اس سلسلے کا آخری

مضمون ڈاکٹر ناہید قاسمی کے رسالہ ''فنون'' میں پڑھا تھا جو انہوں نے ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم کی شخصیت اور فن پر لکھا تھا۔ موسیقی کے فن پر تکنیکی مضامین لکھنے میں سعید ملک صاحب نے بڑا نام پیدا کیا تھا لیکن ان کے مضامین انگریزی اخبارات میں چھپتے تھے۔ شبنم شکیل نے یہ خدمت اردو میں انجام دی۔ یہ مضامین پڑھ کر میرے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ شبنم شکیل اگر انہیں کتاب کی صورت میں چھاپ دیں تو یہ نہ صرف موسیقی کے فن کی خدمت ہو گی۔ بلکہ ان کی ادبی شخصیت کی ایک اور جہت بھی سامنے آجائے گی۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار ''تجدید نو'' کی مدیرہ عذرا اصغر سے کیا تو انہوں نے بتایا کہ شبنم شکیل یہ کتاب مرتب کر رہی ہیں لیکن 2 مارچ 2013ء کو ان کی وفات کی خبر آ گئی۔ ان کی رحلت سے پاکستان کے ادبی اُفق سے وہ ستارہ غروب ہو گیا جس کی فنی اور فکری کرنیں کئی جہات کو منور کر رہی تھیں۔ افسوس اے وائے افسوس۔

پروفیسر صابر لودھی

آپ کو یہ حقیقت ضرور انوکھی محسوس ہو گی کہ اردو کے معروف خاکہ نگار صابر لودھی (مصنف: بھلایا نہ جائے گا'') سے میری شناسائی ایک غیر متعارفہ خاتون کے وسیلے سے ہوئی جن سے میری کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔ صابر لودھی شاعر تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک سال کی نظموں کا جائزہ محترم محمد طفیل کے عہد ساز رسالہ ''نقوش'' میں لکھا تو اس میں صابر لودھی کی ایک نظم کی تحسین بھی کی۔ مجھے یاد ہے کہ اس مضمون پر محمد طفیل صاحب نے خصوصی نوٹ لکھا تھا کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے نوخیز و نو آموز شعرا کی تخلیقات کی تحسین میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ جبکہ آغا صاحب کا خیال تھا کہ انہیں جن نظموں میں ندرت اور شاعر کے اظہار میں جدت نظر آتی تھی، ان کی تخلیقی صلاحیت کی تحسین ضروری خیال کی تھی اور اس سلسلے میں ہی انہوں نے صابر لودھی صاحب کی نظم کا ذکر خصوصی طور پر کیا تھا لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ رسالہ ''نقوش'' میں ڈاکٹر وزیر آغا کی تحسین کے بعد صابر لودھی مجھے کسی رسالے میں کسی حیثیت میں بھی نظر نہ آئے اور ان کا نام بھی مجھے یکسر بھول گیا۔

مولانا صلاح الدین احمد کی جون 1964ء میں ناگہانی وفات کے بعد اس دور کے جلیل القدر رسالہ ''ادبی دنیا'' کی ادارت مولانا کے فرزندوں نے دوسرے ہاتھوں (محمد عبداللہ قریشی) میں منتقل کر دی تو ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنا رسالہ جنوری 1966ء میں ''اوراق'' کے عنوان سے جاری کیا جو در حقیقت مولانا صلاح الدین احمد کے ادبی مشن کا ہی علمبردار تھا۔ ''اوراق'' کے پہلے پرچے میں افسانہ نگاروں کی فہرست میں مجھے ایک نیا نام فرخندہ لودھی کا نظر آیا جن کا افسانہ ''پاربتی'' سب سے آخر میں چھپا تھا۔ یہ افسانہ ستمبر 1965ء کی ہند پاک جنگ کے سماجی اور واقعاتی پس منظر میں لکھا گیا تھا اور فنی لحاظ سے اتنا پختہ تھا کہ میں رسالہ ''اوراق'' کے خطوط کے

کالم میں مصنفہ کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ افسانہ ''پاربتی'' مجھے ہی پسند نہیں آیا تھا بلکہ جس کسی نے پڑھا اس نے اس کی تحسین کی اور فرخندہ لودھی کو اس دور کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں مقام فضیلت عطا کر دیا۔

اس دوران میں مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو میں اپنے دوست غلام الثقلین نقوی کو، جو ادبی دنیا میں ایک اعلیٰ پائے کے افسانہ نگار کی حیثیت میں اپنا مقام بنا چکے تھے، ملنے کے لیے سنٹرل ٹریننگ کالج چلا گیا۔ یہ ملاقات درحقیقت ''پاربتی'' پر بحث کی ملاقات بن گئی۔ ہم دونوں اس افسانے پر باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ایک دبلا پتلا، صبیح رو، متبسم آنکھوں پر چشمہ لگائے، متوسط قد کا خوش لباس نوجوان اپنے ہونٹوں پر تابندہ مسکراہٹ لیے کمرے میں داخل ہوا اور غلام الثقلین نقوی صاحب سے تین چھپیاں ڈال کر میری طرف متوجہ ہوا اور مجھے بھی اپنے معانقے کی پرخلوص گرمی سے سرفراز کر کے اجنبیت کو اپنائیت میں بدلنے کی کوشش کی۔

نقوی صاحب نے تعارف کرایا ''یہ صابر لودھی ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ اردو سے وابستہ ہیں اور طلبہ کے ہر دلعزیز استاد ہیں۔'' وہ بات جو نقوی صاحب کو سب سے پہلے بتانی چاہیے تھی، چائے کا آرڈر دینے کے بعد بتائی کہ وہ ''پاربتی'' کی مصنفہ فرخندہ کے شوہر ہیں۔ صابر لودھی صاحب سے یہ پہلی اتفاقیہ ملاقات میرے لیے حیرت انگیز تھی اور وسیلہ ان کی بیگم تھیں جن کا نام اس سے قبل میں نے سنا بھی نہیں تھا لیکن افسانہ ''پاربتی'' نے ان کے فن کا نقش میرے دل پر گہرا مرتسم کر دیا تھا۔ چنانچہ غلام الثقلین نقوی کی خبر پر میں کرسی سے اٹھا اور صابر لودھی سے دوبارہ بغلگیر ہو گیا اور محسوس کیا کہ اس معانقے کا سواد پہلے تین معانقوں سے وکھرا تھا اور پھر غلام الثقلین نقوی اور میں افسانے ''پاربتی'' پر مزید بات کرنے لگے۔ صابر لودھی اس محفل ثلاثہ کے خاموش سامع تھے لیکن جب فرخندہ لودھی کی تعریف کا پہلو سامنے آتا تو ان کی آنکھیں مسکرا اٹھتیں۔ رخصت ہونے لگے تو انہوں نے ہم دونوں کو شام کی چائے پر مدعو کر لیا۔ صابر لودھی ان دنوں بی بی پاک دامن کے محلے میں کرائے کے مکان میں رہتے تھے جو ریلوے ہیڈ کوارٹر کے

متصل اینگلوانڈین لوگوں کا محلہ تھا۔

شام کے ڈھلتے سایوں میں غلام الثقلین نقوی اور میں رکشا سے اُتر کر صابر لودھی صاحب کے سادہ سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو جس ملیح صورت خاتون نے دروازہ کھول کر ہمیں صوفے پر بیٹھنے کی دعوت دی ، وہ فرخندہ لودھی ہی تھیں۔ نقوی صاحب تو ان سے متعارف تھے لیکن مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ اس قسم کے دھچکے سے نقوی صاحب بھی دوچار ہو چکے تھے۔ انہوں نے فرخندہ لودھی سے پہلی ملاقات کے تحیر کا ذکر رسالہ ''اوراق'' میں ان الفاظ میں کیا:

''1962ء کے موسم بہار میں چھٹیوں میں رابطے کا پہلا لمحہ وجود میں آیا۔ ان دنوں میں بہاول نگر میں تھا۔ میرے ایک نوجوان رفیق کار اے، بی، اشرف میرے ہمراہ تھے۔ ہم ''فنون'' کے دفتر سے اُتر کر انارکلی میں داخل ہوئے تو غالباً سہ پہر کا وقت تھا۔ ہم مدیر ''فنون'' کے ساتھ ایک عظیم ملاقات کے نشے میں سرشار تھے۔ اس لیے وقت کا اندازہ مشتبہ سا ہو گیا تھا۔ ہماری نظر ایک جوان جوڑے پر پڑی، پتا نہیں کیا وجہ ہے کہ انارکلی کے راہ گیروں میں مجھے یہ جوڑا ایک نہایت پرکشش انفرادیت کا حامل نظر آیا۔ دونوں میں جوانی اور چھریرا بدن مشترک تھے لیکن چہروں کی ملاحت اور صباحت میں چلتی پھرتی صورت تضاد مجھے نظر آئی اس نے مجھے دوبارہ بلکہ سہ بارہ مجبور کیا کہ ان چہروں کو دیکھوں ...... اے، بی، اشرف بولے ''یہ پروفیسر صابر لودھی ہیں اور گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے ہیں'' ..... ''لیکن وہ جوان کے ساتھ ہیں وہ کون ہیں؟'' ...... ''یہ ان کی دھرم پتنی ہیں، فرخندہ، کسی کالج میں پڑھاتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب ان کی آنکھوں پر مرمٹے۔ ورنہ ہم نے تو سنا تھا کہ جب وہ اورینٹل کالج میں پڑھتے تھے تو ایک مہدہ شباب لڑکی پر

مر مٹے تھے۔''

چائے کی میز پر جب باتیں شروع ہوئیں تو صباحت اور ملاحت کا یہ تضاد یکسر ختم محسوس ہوا اور صبح کاذب کے ملگجے اندھیرے میں صبح صادق کا نور ملتا چلا گیا۔ صابر لودھی گورنمنٹ کالج لاہور کے لیکچرار تھے اور فرخندہ لاہور کے ایک اونچے درجے کے نسوانی کالج میں لائبریرین تھیں۔ دونوں کو علمی، ادبی اور فکری کتابوں کے مطالعے کا شوق تھا۔ افسانہ دونوں کی خصوصی دلچسپی کا موضوع تھا اور یہ بھی احساس ہوا کہ ''پاربتی'' فرخندہ لودھی کا پہلا افسانہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ افسانے کا ریاض عرصے سے کر رہی تھیں اور وہ اس فن کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا تبادلہ کرتے تو کئی نادر نکتے پیدا ہوتے چلے جاتے۔ صباحت و ملاحت کے ملاپ میں مجھے یہ قدر مشترک نمایاں نظر آئی۔ دوسری اہم بات یہ دیکھی کہ صابر لودھی اور فرخندہ لودھی وقفوں وقفوں سے اٹھ کر ساتھ کے کمرے میں جاتے۔ واپس آتے تو آنکھوں آنکھوں میں طمانیت کا اظہار کرتے اور پھر باتوں میں شامل ہو جاتے۔ معلوم ہوا کہ ساتھ کے کمرے میں صابر لودھی کے والد محترم فالج زدہ حالت میں بستر علالت پر پڑے تھے اور محفل کی گفتگو میں بھی ان کی توجہ انہیں کی طرف رہتی تھی (غلام الثقلین نقوی کے ساتھ میں بھی دم رُخصت ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کی شفقت اور دعا حاصل کی)۔ اس ملاقات میں صابر لودھی نے فرخندہ کو بار بار یہ احساس دلانے کی سعی کی کہ افسانہ ''پاربتی'' پر پہلی تنقیدی رائے رسالہ ''اوراق'' میں انور سدید نے دی تھی۔ میں ان کی بات سن کر جھینپ جاتا لیکن فرخندہ...... مجھے ''بھائی جان'' ۔۔۔ ''بھائی جان'' کہہ کر مخاطب کرتی اور شکریہ ادا کرتی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اسے مخاطب کا رسمی اور محفوظ انداز سمجھا لیکن فرخندہ نے مجھے اپنے حقیقی بھائیوں ریاض، غیاث اور عبدالخالق کا مقام دے دیا۔ اس رشتے کے حوالے سے صابر لودھی میرے بہنوئی تھے اور میں یہ بات کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا کہ اس پہلی ملاقات کے بعد اس کنبے سے تعلقات مضبوط تر ہوتے چلے گئے۔

جناب حنیف رامے وزیر اعلیٰ پنجاب بنے اور انہوں نے اقبال ٹاؤن لاہور میں کچھ

پلاٹ ادیبوں کے لیے بھی مختص کیے تو صابر لودھی صاحب نے اپنے ساتھ میرے لیے بھی پانچ مرلے کا ایک پلاٹ حاصل کرنے میں میری بے لوث مدد کی۔ محکمہ آبپاشی سے ریٹائرمنٹ کے بعد میرا ارادہ اپنی جنم بھومی سرگودھا میں آباد ہونے کا تھا اور میں یہ پلاٹ فروخت کر دینا چاہتا تھا لیکن صابر لودھی صاحب نے سنا تو میرے منصوبے کی شدید مخالفت کی اور گھر تعمیر کرانے پر اصرار کیا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ میرے اس گھر کی تعمیراتی نگرانی صابر اور فرخندہ لودھی نے کی جو دو مکان چھوڑ کر میرے پڑوسی تھے۔ گھر تعمیر ہو گیا تو میں نے 1981ء میں اپنا تبادلہ لاہور میں کرا لیا اور صابر لودھی اور فرخندہ لودھی نے اتنی محبت نچھاور کی کہ مجھے ادب کے رشتے خون کے رشتوں سے زیادہ مضبوط نظر آنے لگے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ فرخندہ جب کوئی اچھی ڈش تیار کرتی تو صابر صاحب سب سے پہلے ہمارے گھر دینے آتے اور میری بیوی اس نسخے کے مطابق اپنے گھر پر ڈش تیار کرتی تو صابر اور فرخندہ اس کی دادیوں دیتے جیسے نصرت نے سہل ممتنع میں غزل کہی ہو۔ میرے چاروں بیٹوں مسعود، امتیاز، ندیم اور انس کے ہاں پہلی بیٹی پیدا ہوئی تو صابر اور فرخندہ ہر مرتبہ ان کے لیے خالص سونے کے آویزے بنوا کر لائے اور اب میں کہہ سکتا ہوں کہ اگرچہ یہ دو کنبے الگ الگ مکانوں میں آباد تھے لیکن ان کے مکینوں کے دل باہمی محبت سے سرشار تھے اور یہ ایک دوسرے کے دکھ اور سکھ میں شریک تھے اور زندگی کے آخری لمحات تک فرخندہ اور صابر لودھی نے بھائی اور بہنوئی کے رشتے کے تقدس کو قائم رکھا اور ان کے لے پالک بیٹے عادل شہریار کی شادی ہوئی تو اس کی بہن نے اپنے بزرگ کی حیثیت میں دلہن کے سر پر دست شفقت رکھنے کے لیے مجھے کہا۔ اس وقت صابر لودھی میرے پاس کھڑے تھے۔

صابر لودھی کا خاندان بستی پٹھاناں کا رہائشی تھا جو متحدہ پنجاب کی ریاست پٹیالہ کی ایک ایسی بستی تھی جس میں ہر طرف یوسف زئی، نیازی، سوری اور لودھی پٹھانوں کی حویلیاں تھیں۔ ان میں سے ہر خاندان کا مزاج جداگانہ، شاہانہ اور منفرد تھا لیکن شادی بیاہ کے موقع پر سب پٹھان اکٹھے ہو جاتے۔ صابر لودھی نے اس بستی کے ایک بزرگ پٹھان روح اللہ خان کا ذکر کیا ہے جو زندہ دل

اور بے باک طبع تھے۔ شادی بیاہ کے موقع پر نکاح مسنونہ کے بعد چھوہارے اچھالنے کا فریضہ انہوں نے سنبھال رکھا تھا۔ صابر صاحب لکھتے ہیں:

''ان کے اشارے پر ہم طرے دار بزرگوں کے گرد جا بیٹھتے۔ روح اللہ خان ایک بڑا سا چھینٹا پگڑیوں کی طرف اچھالتے۔ ہم چھوہارے لوٹنے کے لیے عماموں کی طرف زقند بھرتے ایک دو چھوہارے مٹھی میں آ جاتے مگر طرے دار پگڑیاں دور جا پڑتیں۔''

بچپن کے ان واقعات نے صابر لودھی کی مزاج سازی میں ایک خاص کردار ادا کیا اور وہ طرہ اونچا اور شملہ بلند رکھنے والوں کے خلاف ڈٹ جانے میں تاخیر نہیں کرتے تھے۔ فرخندہ لودھی کا مشاہدہ تھا:

''صابر صاحب از خود کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوتے البتہ اگر خطرہ اپنے آپ دروازے پر آ جائے تو انہیں اختلاج قلب نہیں ہوتا۔ دوڑ دوڑ کر خطرے کے سامنے جائیں گے۔ الٹے پاؤں لوٹ کر آئیں گے۔ تفصیل بتائیں گے۔ پھر جائیں گے۔ تدارک بھی کر ہی لیتے ہیں خواہ دل و جان پر بیت جائے۔''

گزشتہ نصف صدی کے تعلقات کے دوران میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ صابر لودھی فطری طور پر حزب اختلاف کا مزاج رکھتے تھے لیکن شائستگی کا عالم یہ تھا کہ اپنے مخالفین کی غیبت نہ کرتے اور اپنے دل کی بات بھری محفل میں ان کے سامنے کہہ دیتے۔

صابر صاحب اپنے ماں باپ کی لاڈلی اولاد تھے۔ ان کی پیدائش سے پہلے ان کے نو بہن بھائی شیر خوارگی یا کم سنی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ان کی پیدائش کے لیے پیران پیر کلیر شریف (احمد علی صابرؒ) کی ایک درویشنی نے دعا کی تھی جو مستجاب ہوئی اور وہ پیدا ہوئے تو ان کا نام صابر رکھا گیا۔ یہ درویش خاتون کالا لباس پہنتی تھی۔ اس کے درویشانہ لباس کا رنگ

بھی صابر لودھی کے مزاج کا حصہ بن گیا اور انہوں نے اپنے لڑکپن میں ہی اعلان کر دیا کہ ان کی بیوی لازماً سانولی ہوگی۔ لڑکپن میں ملاحت کی طرف رغبت کا ذکر اپنے احساس حسن کے سلسلے میں یوں کیا ہے:

''میں نے جس خانوادے میں آنکھ کھولی، وہاں صباحت کا راج تھا۔ ملاحت کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی تھیں۔ چاروں طرف گورے گورے صحت مند پٹھان اور پٹھانیاں، نقش و نگار پر صحت مندی کا غلبہ، مہر و وفا اور لطف و عنایت کی فراوانی۔ میں نے دس برس اس ماحول میں گزارے۔ پھر اباجی مجھے پونا لے گئے۔ مجھے پانچ چھ میل دور پونا کے ایک سکول میں پانچویں جماعت میں داخلہ مل گیا تھا۔ ایک سکول بس ہمیں سکول لے جاتی اور دو بجے بعد دوپہر واپس لے آتی۔ ہماری کالونی کی ایک لڑکی روزی بھی بس میں سفر کرتی تھی۔ وہ پونا کے ایک بڑے سکول میں پڑھتی تھی۔ اینگلو انڈین روزی ملاحت میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ نقوش بہت تیکھے اور شرمیلی سی مسکراہٹ۔ میں نے پہلی بار حسن کا احساس کیا تھا۔ اس کے علاوہ آبنوسی رنگ ہر سمت پھیلا ہوا تھا۔ مرہٹی عورتیں اپنی مخصوص ساڑھی اور چولی میں ملبوس، بالوں کے جوڑے میں سپید پھولوں کے گجرے سجائے میر حسن کے مصرع ''ادھر اور ادھر آتیاں جاتیاں'' کی تصویر بنی نظر آتیں۔ ان کے دمکتے ہوئے آبنوسی رنگ میں بڑی کشش تھی۔''

بستی پٹھاناں کی صباحت کے برعکس، کرکی (پونا) کی ملاحت صابر صاحب کے لڑکپن میں ہی حسن کا میزان بن گئی اور اس وارفتگی شوق میں ہی ان کی ملاقات لائبریری سائنس کے شعبے کی ایک طالبہ سے ہوئی تو نوجوانی کے اس عالم میں ایک نامحرم کو محرم بنانے کی آرزو ان کے دل میں پیدا ہو گئی اور قدرت نے اس آرزو کی تکمیل کے اسباب بھی پیدا کر دیے

اور ان کی شادی فرخندہ لودھی سے ہوگئی جسے صباحت و ملاحت کا مثالی ملاپ تسلیم کیا گیا۔

1947ء میں صابر صاحب روپڑ کے ایک سکول میں آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ان کا مشاہدہ تھا کہ سکھوں کی اکثریت کے باوجود روپڑ کے لوگوں میں بڑا بھائی چارہ تھا، زندہ دلی تھی۔سکون تھا اور رنگینیاں بھی تھیں لیکن مئی کے مہینے میں فضا یکسر بدل گئی اور ''راج کرے گا خالصہ'' کے نعرے گونجنے لگے۔فرقہ وارانہ فسادات کی قتل وغارت گری میں پاکستان معرض وجود میں آ گیا تو لودھی صاحب کا خاندان بھی مسلمانوں کی آزاد مملکت کی طرف روبہ ہجرت ہو گیا۔صابر لودھی نے ہجرت کے بعد آسودگی کا یہ دور ملتان کے گردونواح کے شہروں میں گزارا۔ بی اے ایمرسن کالج ملتان سے اور ایم اے (اردو فارسی) اورینٹل کالج لاہور سے کیا جہاں انہیں ڈاکٹر سید عبداللہ اور سید وقار عظیم جیسے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا اور ادب کا ذوق اور مطالعے کا شوق پروان چڑھتا گیا۔ طالب علمی کے اس دور میں ہی صابر صاحب کے دل میں ایک طالبہ کے احترام میں چاہت بھی شامل ہوگئی تو انہوں نے سوچا'' یہ لطیف جذبات اگر دائمی رشتے میں بدل جائیں تو کیسا رہے؟'' اس لڑکی نے صابر صاحب کو بتایا'' سید عبداللہ صاحب کو ہمارے خاندان میں سرپرست کی حیثیت حاصل ہے۔وہ آپ کے حق میں رائے دے دیں تو معاملہ منٹوں میں طے ہوسکتا ہے۔'' صابر لودھی نے سید صاحب کو اعتماد میں لے لیا۔سید صاحب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور کہا'' اللہ تمہارے لیے وہ کرے جو تمہارے حق میں بہتر ہو'' اگلے دن صابر صاحب کی ملاقات اس لڑکی سے ہوئی۔اس نے بتایا کہ سید صاحب رات ہماری طرف آئے تھے۔ تمہارا قصیدہ پڑھ رہے تھے۔تمہاری ترقی کے لیے دعا گو تھے لیکن اپنا فیصلہ انہوں نے ان الفاظ میں سنایا'' وہ بڑا ہی ملتون مزاج ہے شادی کی حماقت نہ کیجئے۔''

صابر لودھی نے اسے پہلی شکست قرار دیا ہے لیکن جب ان کی زندگی میں فرخندہ لودھی داخل ہوگئی تو انہوں نے اس بات کی توثیق کی کہ'' رشتے تو آسمان پر طے ہوتے ہیں۔ ہم بے وجہ جذباتی ہو کر اپنی زندگی کو بربادی کے راستے پر ڈال دیتے ہیں'' اور یہ بھی بین حقیقت ہے کہ

انہوں نے اس کے بعد اپنی زندگی بہت سوچ سمجھ کر، سنبھل کر اور سینت کر گزاری اور جذباتیت سے کبھی مغلوب نہ ہوئے اور اپنے فیصلے من کی سوچ کے مطابق کیے۔ ان کے حلقہ احباب کے سب لوگ جانتے ہیں کہ صابر لودھی ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ گورنمنٹ کالج کے طلباء کو پڑھاتے تو ان کے طلبہ یوں محسوس کرتے جیسے وہ نصاب کے متن کے خود مصنف ہوں۔ ان میں انتظامی امور سلیقے اور قواعد وضوابط کے مطابق انجام دینے کی صلاحیت موجود تھی۔

سی ایس ایس کا امتحان دے کر افسر بھی بن سکتے تھے لیکن بچوں کو تعلیم دینا اور ان کی تربیت صحت مند خطوط پر کرنا انکا شوق تھا اور اس شوق کے تحت ہی انہوں نے تعلیم کی پہلی ملازمت اپچی سن کالج لاہور میں حاصل کی لیکن پنجاب کے امراء کا یہ کالج ان کے مزاج پر پورا نہ اترا اور وہ اسی برس میونسپل کالج اوکاڑہ چلے گئے۔ 1961ء میں ایک سال مظفر گڑھ گورنمنٹ کالج میں طلباء کو اردو زبان و ادب کی تعلیم دی اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور آ گئے۔ اس کالج نے ان پر ترقی کے دروازے کھول دیے اور وہ 1994ء میں 60 برس کی عمر پر ریٹائر ہوئے تو پروفیسر کے عہدے پر پہنچ چکے تھے۔ ایک عینی شاہد کا بیان ہے:

> "صابر لودھی صاحب کو گورنمنٹ کالج لاہور سے جنون کی حد تک عشق تھا اور اس کالج کے طلباء ان کا سرمایہ افتخار تھے۔ انہیں شاگردوں سے محض پیار ہی نہیں ان پر غیر متزلزل اعتبار بھی ہے۔ پروفیسر لودھی اور شاگردوں میں محبت دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ماں باپ کے بعد اگر کوئی رشتہ مضبوط، مربوط اور بے لوث ہے تو وہ استاد اور شاگرد کا ہے اور اس کی اور کوئی مثال ہی نہیں...... اور انہیں افکار وحوادث کے باوجود جو اطمینان زندگی میں حاصل رہا وہ صرف استاد ہونے کی وجہ سے ہے۔"

صابر لودھی صاحب کا سینہ علم و دانش کا خزینہ تھا اور اس خزینے کو انہوں نے اپنے

شاگردوں اور غیر شاگردوں میں بے دریغ لٹایا۔ نقصان یہ ہوا کہ ان کے ادبی افکار و تصورات ضابطہ تحریر میں نہ آسکے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو ادب میں قلم کاروں کی جو کہکشاں اب منور نظر آتی ہے اس کے بہت سے ستارے صابر لودھی صاحب کے تربیت یافتہ ہیں۔ کوئی سوال کرتا کہ لودھی صاحب، آپ اپنے علم کو زبانی لٹانے کی بجائے، لکھتے کیوں نہیں؟ تو وہ ترت جواب دیتے۔۔۔ ''میری مرضی۔۔۔ میری مرضی نہیں لکھتا' اور میں تو اسے حادثہ ہی کہوں گا کہ سید وقار عظیم صاحب نے ان کے لیے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع ''اردو تذکرے اور تذکرہ نگاری'' منظور کرایا تو صابر لودھی نے اپنی مرضی کو فوقیت دی اور مقالہ لکھنے کی طرف راغب نہ ہوئے اور جب پتہ چلا کہ اس موضوع پر کراچی یونیورسٹی میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کام کر رہے ہیں تو انہوں نے خوشی کا اظہار کیا کہ اس اہم موضوع پر ان سے بہتر کام کرنے والا ادیب، محقق اور دانشور میدان عمل میں آ گیا ہے۔ فرخندہ انہیں لکھنے کی ترغیب دینے میں کبھی کوتاہی نہ کرتی لیکن صابر لودھی ان کی بھی نہ مانتے۔ ہاں بھی کبھی خوش کرنے کے لیے کہہ دیتے۔۔۔ ''تم جو لکھتی ہو۔۔۔ کافی ہے۔''

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا کوئی دوست دنیا سے اٹھ جاتا اور وہ غم سے مغلوب ہو جاتے تو ان کے باطن کا ادیب بیدار ہو جاتا اور وہ اس کا خاکہ لکھ کر اپنا غم غلط کرنے کی سعی کرتے۔ خاکہ نگاری میں انہیں قدرت کی طرف سے جو اسلوب اور تکنیک ودیعت ہوئی تھی، اسے بھی انہوں نے پوری طرح استعمال نہیں کیا۔ وجہ شاید یہ تھی کہ وہ شاعری اور فکشن کو تخلیقی ادب میں شمار کرتے تھے۔ ان کی رائے میں:

> ''فکشن لکھنے والا اپنے کرداروں کے ذریعے شخصیت کی تخلیق کرتا ہے اور خاکہ نگار شخصیت کے وجود سے تخلیقی عمل کو بروئے کار لانے کی سعی کرتا ہے۔ وہ شخصیت کے طلسم کدے سے اپنے فن میں نکھار لاتا ہے۔ خاکے کی تخلیق ثانوی درجے پر آتی ہے۔''

تاہم یہ امر غنیمت ہے کہ صابر لودھی اپنے کچھ دوستوں اور شاگردوں کے اصرار پر اور بالخصوص فرخندہ لودھی کی خواہش پر اپنے بکھرے ہوئے خاکے جمع کرنے پر آمادہ ہو گئے اور اپریل 2010ء میں جب فرخندہ علیل تھیں ان کی کتاب ''بھلایا نہ جائے گا'' منظر عام پر آ گئی۔ اس کتاب میں ڈاکٹر سید عبداللہ، سید وقار عظیم، قیوم نظر، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر محمد اجمل، رحمٰن مذنب، مرزا منور، ڈاکٹر محمد حمید الدین، غلام الثقلین نقوی، میرزا ریاض اور جعفر بلوچ کے خاکے شامل ہیں جو اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن اس کتاب میں زندہ نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور فرخندہ لودھی پر خاکے لکھے گئے تھے تو وہ زندہ تھے لیکن اب ان کے نقوش حیات بھی اس کتاب میں تابندہ ہیں اور میں کہہ سکتا ہوں کہ صابر لودھی اپنی اس ایک کتاب کی وجہ سے اردو ادب میں پطرس بخاری کی طرح زندہ رہیں گے۔
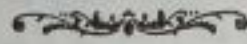
ڈاکٹر صدیق جاوید

ڈاکٹر صدیق جاوید کے سانحہء ارتحال سے ایک خردمند اقبال شناس اس دنیاے رخصت ہوگیا اور وہ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عاشق بٹالوی مولانا عبدالمجید سالک، سید عابد علی عابد، سید نذیر نیازی، ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر وزیر آغا، محمد عبداللہ قریشی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، یوسف سلیم چشتی، اسلوب احمد انصاری، محمد عبداللہ قریشی، جگن ناتھ آزاد، مرزا محمد منور، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبدالغنی، پروفیسر حمید احمد خان اور مولانا صلاح الدین احمد جیسے مرحومین کی صف میں شامل ہوگئے جنہوں نے علامہ اقبال کی وفات کے بعد ان کی شاعری، فکر و فلسفہ اور حیات و سیرت کا مطالعہ اس گہرائی اور کثرت سے کیا کہ اردو ادب میں "اقبال شناسی" ایک روایت کی حیثیت اختیار کرگئی اور متذکرہ مشاہیر ادب کے علاوہ متعدد دوسرے باشعور اہل قلم نے بھی اقبال کو اپنی مطالعاتی زندگی کا اہم موضوع بنالیا اور اس موضوع کے متعدد گوشوں کو اس طرح روشن کیا کہ اردو ادب میں "اقبالیات" کا باب کھلتا چلا گیا۔ اقبال شناسوں کی طویل فہرست میں ڈاکٹر صدیق جاوید کا نام اس لیے بھی اہم ہے کہ انہوں نے علامہ اقبال کی شاعری اور فکر و فلسفہ پر تحقیق و تنقیدی مضامین ہی نہیں لکھے، بلکہ چند اہم اقبال شناسوں کو بھی اپنا موضوع بنایا اور ان سب کا مطالعہ اپنی خلوت میں عبادت کے جذبے سے کیا اور اثبات و اختلاف کے زاویے خلوص نیت سے ابھارے۔

ڈاکٹر صدیق جاوید نے اپنی پوری زندگی درس و تدریس میں گزاری۔ ان کا شمار گورنمنٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) اور گورنمنٹ کالج لاہور کے ایسے اساتذہ میں ہوتا تھا جو کتاب سے محبت کرتے ہیں اور علمی وادبی کتابوں کے مطالعے کا ذوق اپنے طلبہ میں بھی پیدا کردیتے ہیں۔ اچھی کتاب کی تلاش ان کے ذوق لطیف کا ایک اہم زاویہ تھا اور اس مقصد کے لیے

وہ اکثر ان فٹ پاتھوں کی خاک چھانتے نظر آتے تھے۔ جہاں پرانی کتابیں اور رسائل و جرائد فروخت کیے جاتے ہیں۔ ان کی ذاتی لائبریری میں نایاب، کم یاب اور وقت کی گردش میں گم ہو جانے والے نوادرات کا بڑا ذخیرہ موجود رہتا تھا۔ اس سب کا حاصل یہ تھا کہ انہیں اپنے تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے لیے اساسی مواد اپنے ہی کتب خانے میں مل جاتا لیکن نئے مواد کی تلاش میں لائبریریوں کا دورہ کرنا ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اقبالیات کے موضوع پر ایسے نوادرات بھی تلاش کر لیے تھے جو مقبول اقبال شناسوں کی دسترس میں بھی نہیں تھے۔ آگے بڑھنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صدیق جاوید کے حالات حیات پر یہاں ایک جمالی نظر ڈال لی جائے۔

صدیق جاوید متحدہ پنجاب کے معروف شہر جالندھر میں یکم اپریل 1936ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم چودھری محمد دین تجارت پیشہ تھے اور کاروباری مصروفیات کی وجہ سے وہ اپنے تین بچوں (دو لڑکے اور ایک لڑکی) کی تعلیم پر پوری توجہ نہ دے سکے لیکن اس کمی کو ان کی والدہ نے پورا کیا جو سلیقہ شعار خاتون خانہ تھیں اور تعلیم کی اہمیت سے شناسا تھیں۔ صدیق جاوید ان کے پہلے بیٹے تھے۔ اس لیے انہیں اپنے چھوٹے بھائی اور چھوٹی بہن کے مقابلے میں اپنی والدہ کی زیادہ توجہ حاصل ہوئی۔ 1947ء میں ان کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آیا تو لائل پور (فیصل آباد) کے محلہ گرونانک پورہ میں قیام کیا۔ صدیق جاوید نے میٹرک کا امتحان 1954ء میں پاکستان ماڈل ہائی سکول سے کیا۔ اس دوران انہیں حرف مطبوعہ سے محبت پیدا ہوئی تو کتابوں کے مطالعے نے ان کی سوچ کو بھی مہمیز لگائی۔ علامہ اقبال کی طرف رغبت کا باعث ان کی نظم ''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری'' قرار دی جا سکتی ہے جو سکول کے ابتدائی درجوں میں تعلیمی دن کے آغاز کے طور پر سکول کے سب طلبہ کے اجتماع میں پڑھی جاتی تھی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ان کی دلچسپی ادب کے علاوہ عمرانیات میں بھی پیدا ہوگئی اور سوچ کے زاویوں میں بھی وسعت پیدا ہوگئی۔ انہوں نے ایف اے کا امتحان اسلامیہ کالج لائل پور سے 1960ء میں پاس

کیا۔ ایم اے کی طالبہ سدرہ ہمایوں نے صدیق جاوید پر اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے کہ انہوں نے 1961ء میں ادیب فاضل کے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کی تھی اور 1962ء میں اورینٹل کالج لاہور کے شعبۂ اردو میں ایم اے میں داخلہ لیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ صدیق جاوید نے بی اے کی ڈگری صرف انگریزی کا امتحان دے کر لی ہوگی اور ینٹل کالج لاہور میں تعلیم کے دوران میں انہوں نے مطالعہء اقبال میں خصوصی دلچسپی لی۔ ان کی شاعری اور فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا اور ایم اے کی ڈگری کے لیے مقالہ لکھا تو اپنا موضوع ''بال جبریل کا تنقیدی مطالعہ'' منتخب کیا۔ اس مقالے کے تحقیقی عمل کے دوران دانش اقبال ۔۔۔۔۔صدیق جاوید کی رگ و پے میں سرایت کرتی چلی گئی اور پی ایچ ڈی کرنے کا مرحلہ آیا تو انہوں نے اپنے مقالے کے لیے جو موضوع منتخب کیا وہ ''فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ'' تھا۔

ڈاکٹر صدیق جاوید سے میرا غائبانہ تعارف رسائل و جرائد میں چھپنے والے ان کے مضامین سے ہو چکا تھا۔ وہ کم لکھتے تھے لیکن اقبالیات پر ان کا مضمون چھپتا تو اس کی گہرائی، بحث کا مدلل اور شائستہ انداز پڑھنے والوں کو متاثر کرتا۔ میرا ان سے باقاعدہ تعارف اس وقت ہوا جب محکمہ آبپاشی کے ملازمتی فرائض ادا کرنے کے لیے میری تقرری فیصل آباد میں کردی گئی تھی۔ اس تجارتی و صنعتی شہر کی ادبی کہکشاں پر ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر انور محمود خالد، ڈاکٹر ریاض احمد ریاض، سلیم بے تاب، ڈاکٹر احسن زیدی، عدیم ہاشمی اور افتخار نسیم کے ستارے جگمگا رہے تھے۔ شہر میں چند ادبی انجمنیں بھی موجود تھیں لیکن ڈاکٹر ریاض مجید کی قیادت میں ایک مجلس ادب ہر شام ''محفل'' ہوٹل میں منعقد کی جاتی جس میں ادب کی غیر رسمی گفتگو رات گئے تک جاری رہتی۔ اس محفل میں مجھے صدیق جاوید بہت کم نظر آتے لیکن گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں جانے کا موقع ملتا تو ان سے لائبریری میں ضرور ملاقات ہو جاتی اور پھر وہ کالج کی ''ٹی کلب'' میں ریاض مجید، انور محمود خالد اور ریاض احمد ریاض کے ساتھ ادبی گپ شپ میں بھی شریک ہوتے۔

اہم بات یہ ہے کہ صدیق جاوید ٹی کلب میں آتے تو کتابوں کی ایک بڑی تعداد ان

کی بغل میں ہوتی۔ انہوں نے اس کالج میں قریباً تیرہ برس تک طلباء اور طالبات کو اردو ادب کی تعلیم دی اور ان کے ادبی ذوق کو سنوارا۔ اس کے بعد وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں آ گئے اور لاہور آنا اس لیے ضروری تھا کہ اب ان کی شادی ہو گئی تھی اور ان کی بیگم محترمہ زبیدہ جاوید جو ملک کی نامور مصورہ ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے ''فائن آرٹس'' (Fine Arts) کے شعبے میں اس مضمون کی تعلیم و تدریس پر فائز تھیں۔ ادھر گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو میں ان دنوں پروفیسر قیوم نظر، خواجہ محمد سعید، ملک بشیر الرحمٰن، محمد منور مرزا، صابر لودھی، مشکور حسین یاد، غلام الثقلین نقوی، ملک حسن اختر، مشرف انصاری، مرزا ریاض، ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر معین الرحمان جیسے نامور ادیب موجود تھے۔ اس حلقے میں ڈاکٹر صدیق جاوید کی شمولیت ایک نئے لیکن نامور ستارے کی تھی جس کی ادبی تربیت فکر اقبال کے سائے میں ہوئی تھی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں انہوں نے 60 برس کی عمر میں ریٹائرمنٹ تک قیام کیا اور ایسے اساتذہ میں شمار ہوئے جو مجلس آرائی میں پوری دلچسپی لیتے تھے لیکن طلباء کو تعلیم دینے اور ان کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں کوتاہی نہیں برتتے تھے۔ یہاں صابر لودھی اور غلام الثقلین نقوی کا مشترکہ کمرہ ''ٹی کلب'' کا درجہ رکھتا تھا۔ میں نے اکثر دیکھا کہ جب شرکائے محفل کو چائے پیش کی جا رہی ہوتی اور صدیق جاوید صاحب کی کلاس کا وقت ہو جاتا تو وہ چائے چھوڑ کر اپنی کلاس لینے کے لیے اٹھ جاتے۔ قریباً ایک گھنٹے کے بعد واپس آتے تو چائے کا دور ختم ہو چکا ہوتا۔

لاہور آنے کے بعد ڈاکٹر صدیق جاوید کے موضوعات میں تنوع پیدا ہو چکا تھا لیکن ان کا اہم ترین موضوع اقبالیات ہی تھا۔ اس دور میں ان کی چھ کتابیں شائع ہوئیں ان میں سے بیشتر سلسلہ اقبالیات ہی کی کتابیں تھیں۔ چند نام حسب ذیل ہیں:

(1) اقبال پر تحقیقی مقالے (2) بال جبریل کا تنقیدی مطالعہ (3) فکر اقبال کا عمرانی مطالعہ (4) اقبال کی نئی تفہیم، ان کی دو تالیفات کا موضوع بھی ''اقبالیات'' ہی ہے۔ اول: ''اقبالیات راوی''، جو گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبی جریدہ ''راوی'' میں علامہ اقبال کے فکر و فن،

شاعری اور شخصیت پر چھپنے والے مضامین کا انتخاب ہے۔ دوم: ''اقبال اوران کا فلسفہ'' جو آل احمد سرور کے مضامین کا مجموعہ ہے اور بہت عرصہ پہلے ہندوستان میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر صدیق جاوید 1996ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ریٹائر ہو گئے تھے لیکن اپنے متعدد معاصرین کی طرح انہوں نے ملازمت میں توسیع کرانے یا کنٹریکٹ پر فی لیکچر کے حساب سے علم فروخت کرنے پر کبھی آمادگی ظاہر نہ کی۔ بلکہ اپنی زندگی صرف علمی اور ادبی کاموں کے لیے وقف کر دی۔ ملازمت کے دوران ڈاکٹر صدیق جاوید کا گھر ایم اے او کالج کے قریب شہر کی گنجان آبادی میں تھا۔ گھر کے سامنے کی سڑک پر ویگنوں، تانگوں اور گدھا گاڑیوں کی ٹریفک دن کو جاری رہتی تو رات کو بھی نہ رُکتی۔ صدیق جاوید نے یہ کشادہ مکان فروخت کر دیا اور نیا گھر شہر سے دور ڈیفنس کالونی میں بنالیا۔ اس مکان کی تعمیر میں ان کی بیگم زبیدہ جاوید کا فنون لطیفہ کا ذوق عملی طور پر سامنے آتا ہے اور یہ گھر فن تعمیر کا ایک ایسا مثالی نمونہ ہے جس کی تجریدیت کی مثال پورے لاہور میں نہیں ملتی۔ صدیق جاوید بتایا کرتے تھے ''ادبی مسائل پر غور وفکر اور تنہائی اور خاموشی میں تحقیق وتنقید کے علاوہ کتابوں کے گہرے مطالعے کا مزا ایسی فضا میں ہی ملتا ہے جہاں فطرت آپ سے محو تکلم ہو جاتی ہے اور زیر غور مسئلے کے نادر نکات کا حل غیب سے اترنے لگتا ہے۔''

ڈاکٹر صدیق جاوید قلیل الاولاد پاکستانی تھے۔ ان کا گھرانہ ''بچے دو ہی اچھے'' کی مثال تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کی تربیت اپنی بیگم محترمہ زبیدہ جاوید کی معاونت سے مثالی مشرقی انداز میں کی لیکن اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کے بعد دونوں بچوں کو معاش کی تلاش امریکہ لے گئی۔ جہاں وہ مستقل طور پر آباد ہو گئے اور وہ اپنے والدین کی خدمت کے جذبے کی تکمیل یوں کرتے کہ انہیں ہر سال دو تین ماہ کے لیے امریکہ بلالیتے۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صدیق جاوید کے لیے امریکہ یاترا بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس ملک کی آزادہ فکری نے ان کے مزاج کو متاثر کیا تو ان کا تنقیدی رویہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ اب ان کے دل میں اردو ادب کے شہرت پسند، منصب ومقام کے متلاشی اور روپے کی چوہا دوڑ میں شامل ادیبوں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ میں نے ان کی

ادبی زندگی کا وہ دور بھی دیکھا ہے جب وہ ادیبوں اور نقادوں کی غلطیوں اور ناہمواریوں کو دیکھتے، کف افسوس ملتے اور پھر خاموش ہو جاتے کہ آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے لیکن پھر وہ دور بھی آیا جب ان کے دل میں یہ خیال پختگی سے بیٹھ گیا کہ ادیب کی غلطی ہزاروں گمراہیوں کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے اور اس کا فوری تدارک ضروری ہے۔ اس دور میں اگرچہ وہ پہلے جیسے صحت مند نہیں رہے تھے اور مختلف اقسام کی جسمانی بیماریوں نے ان پر حملہ کر دیا تھا تو دوسری طرف ان کی بیگم محترمہ زبیدہ جاوید بھی علیل رہنے لگی تھیں لیکن ادبی دنیا میں کسی ناہمواری پر ان کی نظر پڑ جاتی تو وہ اسے برداشت نہ کر سکتے۔ ان کی دو کتابیں ''ناطقہ سر بگریباں'' اور ''تنقید کے چراغ تلے'' اردو میں بیان حقیقت اور اظہار صداقت کی ایسی کتابیں ہیں جو بڑی جرات مندی سے لکھی گئی ہیں اور قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر وحید قریشی کے اسلوب تحقیق کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔ اردو کے نامور محقق اور ''سخن در سخن'' کے کالم نگار جناب مشفق خواجہ کی یہ بے لاگ رائے ان کی ایک کتاب ''تحقیق کے چراغ تلے'' کے سرورق کی پشت پر نمایاں طور پر درج ہے:

> ''ڈاکٹر صدیق جاوید ان معدودے چند اہل نقد و تحقیق میں سے ہیں جو کسی موضوع پر لکھتے ہوئے ''وکیلوں کی طرح'' کسی مطلوبہ نتیجے تک رسائی کے لیے دلائل پیش نہیں کرتے بلکہ حقائق کی روشنی میں اپنا نیا راستہ متعین کرتے ہوئے کسی نتیجے تک پہنچتے ہیں۔ یہی طریق کار زیر نظر کتب ''تحقیق کے چراغ تلے'' میں بھی ملتا ہے۔ اس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ اپنی تعریف میں فرمائش بلکہ اصرار کر کے لکھوائے گئے مضامین اور شاگردوں کے نام شائع کردہ مدح سے لبریز کتابوں کے بل پر ہونے والی جھوٹی شہرت علم کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ دوسرے کی کتابوں کو اپنے نام سے چھپوا لینا کمال تو ہے لیکن علم و ادب کی دنیا میں نہیں... کسی اور جگہ... ڈاکٹر صدیق جاوید مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے

قاضی عبدالودود کی روایت پر عمل کیا اور ایک ایسی کتاب لکھی ہے جس میں اردو دنیا کے لیے ایک چشم کشا اور عبرت انگیز داستان بیان کی گئی ہے۔''

اس دور میں ڈاکٹر صدیق جاوید اکثر ملال کرتے کہ بعض نامور ادیبوں کے منتخب مضامین کے مجموعے تو چھپ گئے ہیں اور خلق خدا ان سے استفادہ بھی کر رہی ہے لیکن ان کے بہت سے مضامین رسائل میں بکھرے پڑے ہیں اور ان رسائل تک کسی کی رسائی نہیں ہے۔ انہوں اس قسم کے غیر مدون مضامین کی تدوین کا بیڑہ اٹھایا تو سب سے پہلے عزیز احمد کو منتخب کیا جو بہت عرصہ پہلے پاکستان چھوڑ کر دیار مغرب میں آباد ہو گئے تھے اور وہیں زندگی کا پل صراط عبور کر کے عقبیٰ کو سدھار گئے تھے۔ ڈاکٹر صدیق جاوید نے ان کے مضامین کی دو کتابیں شائع کیں اور انہیں ''متاع عزیز'' کا عنوان دیا۔

مغرب کے مصنفین میں سے اُردو پر ٹی، ایس، ایلیٹ کے ادبی اثرات بیسویں صدی کے ثلث دوم میں نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے۔ ایلیٹ کی نظم ''ویسٹ لینڈ'' کا اردو ترجمہ ''خراب آباد'' کے عنوان سے عزیز احمد نے جنوری 1937ء میں رسالہ ''آرزو'' میں اپنے تعارفی نوٹ سے شائع کرایا تھا۔ ڈاکٹر صدیق جاوید کی اس ترجمے پر اس وقت نظر پڑی جب اس شہرۂ آفاق نظم کے چند مزید تراجم بھی منظر عام پر لائے جا چکے تھے۔ اب ان کی رگ تحقیق پھڑکی کہ یہ سب تراجم کتاب کی صورت میں چھپنے چاہئیں تو انہوں نے تلاش و جستجو کا سلسلہ شروع کر دیا اور اس بات کو بالکل درخور اعتنا نہ سمجھا کہ ان کے دل کا ''بائی پاس آپریشن'' ہو چکا ہے اور وہ تحقیق کا کٹھن کام نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کمر ہمت باندھے رکھی اور رفیق خاور کا ترجمہ ''اجڑا دیار'' اور سید سراج الدین کا ترجمہ ''ارض ویراں'' بھی بازیافت کر لیے۔ ان کے معاصر ڈاکٹر انیس ناگی اور ڈاکٹر محمد اشرف نے ''ویسٹ لینڈ'' کے نئے تراجم کیے تو ان کے حصول میں بھی کوتاہی نہ کی۔ اہم بات یہ ہے کہ اس تحقیقی عمل کے دوران انہوں نے رفیق خاور، پروفیسر صدیق کلیم، محمد حسن عسکری، محمد احسن فاروقی، شمس الرحمان فاروقی، قیصر تمکین، ڈاکٹر سہیل احمد خان

اور ڈاکٹر عظمت رباب کے وہ مضامین بھی تلاش کر لیے جو انہوں نے ٹی ایس ایلیٹ کے حوالے سے لکھے تھے۔ اپنی تحقیق کے مختلف مراحل کا تذکرہ ایک ''پیش لفظ'' میں تفصیل سے کیا اور ''ٹی، ایس، ایلیٹ اور اردو ادب'' کے عنوان سے ایک تحقیقی جائزہ بھی لکھا جو اپنی مثال آپ ہے۔ یہ تحقیقی کتاب 2012ء میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے اشاعتی ادارہ ''مغربی پاکستان اردو اکیڈمی'' سے شائع کی اور اب زیر بحث ہے۔

ڈاکٹر صدیق جاوید کی کتب بینی نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا اور جب ان کی کتاب ''مشفق خواجہ اور صدیق جاوید کے مابین مراسلت'' منظر عام پر آئی تو ان کی مکتوب نویسی کا زاویہ بھی بے حد منور نظر آیا۔ اس مراسلت میں صدیق جاوید ایک جرأت مند اور حق گو مکتوب نگار کی حیثیت میں سامنے آتے ہیں اور ادبی معاشرے پر کھلی تنقید ہی نہیں کرتے بلکہ بعض نامور شخصیات کی ناہمواریوں کو بھی زد قلم میں لاتے ہیں اور مکتوب الیہ پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی نجی باتیں بھی آزادانہ کہتے چلے جاتے ہیں۔ ایسی دلچسپ اور انکشاف انگیز مراسلت اردو کے ''مکتوباتی ادب'' میں کم کم نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر صدیق جاوید کی ذاتی لائبریری بہت وسیع تھی لیکن ان پر ایسا کڑا وقت بھی آیا کہ انہیں اپنی اس معنوی اولاد کی مفارقت قبول کرنا ناگزیر ہو گئی۔ انہوں نے بادل نخواستہ زندگی کے استمراری عمل کو جاری رکھنے کے لیے یہ مرحلہ طے کر لیا لیکن لمبے عرصے تک اداسی ان پر طاری رہی اور یہ اداسی اس وقت دور ہوئی جب ان کی لائبریری کی الماریوں میں کتابیں پھر سج گئیں۔ تاہم انہیں یہ اطمینان ضرور تھا کہ ان کی سابقہ لائبریری کی کتابیں ایک ایسے نجی کتب خانے میں پہنچ گئی ہیں جہاں تشنہ کامان تحقیق کشاں کشاں پہنچتے ہیں تو صدیق جاوید کی کتابوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کی اس خوبی کا ذکر بھی ضروری ہے کہ کتب مستعار دینے میں وہ کبھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے لیکن مستعار کتاب لینے والے سے یہ توقع ضرور رکھتے تھے کہ استفادہ کے بعد واپس کر دیں گے۔ زندگی کے آخری دنوں میں ایک ادیب کا جو کبھی صدیق جاوید کا قریبی

دوست تھا، نام آتا تو وہ موضوع کو اس کرب ناک انداز میں تبدیل کر دیتے کہ دوبارہ اس کا نام نہ آئے۔ ڈاکٹر انور محمود خالد نے مجھے بتایا کہ یہ صاحب، ڈاکٹر صدیق جاوید کی لائبریری سے بہت سی کتابیں اپنے تحقیقی کام کے لیے مستعار لے گئے تھے لیکن جب اپنے کام کی تکمیل کے بعد بھی واپس نہ کیں تو صدیق جاوید نے ان سے قطع تعلق کر لیا اور وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بیشتر کتابوں کی عدم موجودگی ان کے اپنے تحقیقی کاموں کے آگے رکاوٹ بن گئی تھی اور کتابیں بھی ایسی تھیں جو مارکیٹ یا عام کتب خانوں میں دستیاب نہیں تھیں۔ دوسری طرف میرا ذاتی تجربہ یہ تھا کہ صدیق جاوید کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی کتاب کی طلب میری آنکھوں میں چمک بن جاتی تو یہ کتاب مجھے عطا کرتے ہوئے واپسی کا تقاضا نہ کرتے۔ ڈاکٹر انور محمود خالد کے بقول اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر صدیق جاوید کو میری طلب صادق کے ساتھ جسمانی معذوری کا احساس ہوتا تھا اور دوسرے وہ کتاب اردو بازار میں دستیاب بھی ہوتی تھی۔

ایک سچے محقق کی حیثیت میں کتاب کے مطالعے کے دوران ڈاکٹر صدیق جاوید کی آنکھ نقطہ اختلاف فوراً تلاش کر لیتی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ وہ دوستوں کی کتابوں پر تنقید کرتے تو ''آدھے خالی گلاس'' کو ''آدھا بھرا ہوا گلاس'' کہنے کا رویہ پیش نظر رکھتے۔ ان کی ادبی شخصیت کا یہ زاویہ بالخصوص اس وقت میرے سامنے آیا جب انہوں نے میری کتاب ''اقبال کے کلاسیکی نقوش'' پر ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالہ ''اوراق'' میں ایک طویل مضمون لکھا اور ایک ''ماہر اقبالیات'' کی حیثیت میں چاہتے تو بیسیوں اختلافی نقطے نشان زد کر سکتے تھے لیکن ان کی تنقید تحسین آفرین تھی۔ فرخندہ لودھی کے افسانوں کی کتاب ''آرسی'' کا تعارفی مطالعہ سولہ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ مدلل مقدمے کی ایسی حیثیت رکھتا ہے کہ مصنفہ کے بارے میں مزید کچھ کہنا ممکن نظر نہیں آتا اور افسانے کے فن پر ڈاکٹر صدیق جاوید کی پوری دسترس کا احساس ہوتا ہے لیکن جب فرخندہ لودھی کے افسانوں کا پانچواں مجموعہ ''جب کٹورا چھپا'' تو اس کا ''اختتامیہ'' ڈاکٹر صدیق جاوید نے لکھا تو انہوں نے مصنفہ کے ارتقائے فن کے نئے نکتے دریافت کیے اور فرخندہ لودھی کے طرزِ احساس کا

ذکر آیا تو انہوں نے یہ نادر نقطہ بازیافت کیا جو کسی اور کو نہیں سوجھا:

''ان افسانوں میں مصنفہ کے مذہبی رجحان اور روحانیت سے دلچسپی کے شواہد ملتے ہیں۔''

ڈاکٹر انور محمود خالد فیصل آباد گورنمنٹ کالج میں ڈاکٹر صدیق جاوید کے معاصر تھے اور یہاں ان دونوں کی بے لوث اور خلوص مندانہ دوستی ایسی قائم ہوئی کہ لاہور سے ڈاکٹر صدیق جاوید کی زندگی کے آخری ٹیلیفونی رابطے تک قائم رہی۔ ذاتی غیرت اور غرض مندی کے اس مصروف دور میں انور محمود خالد فیصل آباد سے صرف ڈاکٹر صدیق جاوید سے ملاقات کے لیے لاہور آتے اور بعض اوقات ان سے طویل ملاقات کے بعد اپنی صاحبزادی ڈاکٹر طاہرہ سکندر سے ملے بغیر واپس چلے جاتے۔ دوسری طرف ڈاکٹر صدیق جاوید فیصل آباد جاتے تو بتاتے کہ انور محمود خالد سے ملنے گئے تھے۔ ان کا حلقہء احباب زیادہ وسیع نہیں تھا لیکن وہ خلوص کو دوستی کی پہلی قدر قرار دیتے تھے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، میجر (ر) ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر وحید قریشی، صابر لودھی، فاروق حسن سے ان کے تعلقات کی نسبت دائمی تھی۔ مشفق خواجہ اور ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب لاہور آتے تو ان کے اعزاز میں اپنے گھر پر ایک بڑی ضیافت کا اہتمام ضرور کرتے اور شہر کے ادیبوں کو بھی ان سے ملواتے۔ چنانچہ ان کی پر تکلف محفل طعام بے تکلف ادبی محفل بن جاتی۔

مجھے افسوس ہے کہ صدیق جاوید اپنے بیٹے کے پاس دو ماہ گزار کر گزشتہ دنوں واپس آئے تو میں اپنی جسمانی معذوری کی وجہ سے ان سے ملاقات کے لیے ان کے گھر نہ جا سکا۔ ان سے لمبی ملاقاتیں ٹیلی فون پر ہوتیں۔ ان دنوں وہ اپنی بیگم صاحبہ کی علالت پر بے حد پریشان تھے۔ کوئی دوا کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر انور محمود خالد کو آخری ٹیلی فون کیا تو اس میں بھی غالب موضوع محترمہ زبیدہ جاوید کی بیماری ہی تھی۔ 2 نومبر کو صبح نو بجے تک نہ اٹھے تو ان کے بھتیجے نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ صدیق جاوید کا آدھا دھڑ پلنگ سے لٹکا ہوا تھا۔ میز پر سے دوائیوں کی

شیشیاں نیچے گری پڑی تھیں۔ ایک ہاتھ ٹیلی فون کی طرف لپکتا نظر آیا۔ ڈاکٹر نے آ کر تصدیق کی کہ ان کی روح جسم خاکی سے پانچ گھنٹے ہوئے پرواز کر گئی ہے۔ موبائل فون پر ناصر بشیر نے یہ جاں کاہ خبر نشر کی تو دل دھک سے رہ گیا۔ انور سدید ایک مخلص بے لوث اور بے ریا دوست سے محروم ہو گیا تھا۔ ٹیلی فون کا ایک اور رابطہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا تھا۔ انور سدید کی تنہائی اور بڑھ گئی تھی۔ ادبی دنیا ملول تھی کہ ایک اور صاحب نظر اور خردمند اقبال شناس جہاں سے اٹھ گیا تھا۔

ظفر قریشی

رسالہ ماہ نو کراچی میں شائع ہونے والا ایک پرانا مضمون تلاش کر رہا تھا تو وہ دور یاد آ گیا جب ظفر قریشی اس سرکاری ادبی رسالے کی ادارت کرتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ نئے لکھنے والوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے بلکہ ان کے مضامین نظم ونثر کی نوک پلک بھی سنوار دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے غلام الثقلین نقوی کے افسانوں پر ایک مختصر سا مضمون ''ماہ نو'' کو اشاعت کے لیے بھیجا تو ظفر قریشی نے اس کی تحسین کی لیکن راہنمائی کے طور پر یہ بھی لکھا کہ غلام الثقلین نقوی کے فن کی غالب جہت دیہات نگاری ہے۔ اور میرے مضمون میں اس پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ ظفر قریشی صاحب نے مجھے نقوی صاحب کے چند دیہاتی افسانوں کے تراشے بھیجے اور ارشاد فرمایا کہ ''ان افسانوں کی روشنی میں مضمون دوبارہ لکھیے''۔ مجھے ان کا یہ رویہ بے حد اچھا لگا کیوں کہ اس سے قبل جناب مظہر انصاری نے میرے افسانوں کو ''ہمایوں'' کے اس مواد سے نکالا تھا جسے شیر محمد اختر صاحب نے اپنے دور ادارت میں مسترد کر دیا تھا۔ مظہر انصاری صاحب کی حوصلہ افزائی نے مجھے آگے بڑھنے میں جو مدد دی تھی میں نے اسے ہمیشہ یاد رکھا لیکن ادب میں افسانہ نگاری میرا عارضی پڑاؤ ثابت ہوا۔ محکمہ آبپاشی کی ملازمت کے دوران میں جب میانوالی کے صحراؤں میں نئی نہر کی تعمیر پر متعین ہوا تو ادب کے فریضے کو بھول گیا۔ یا شاید افسانے کی دیوی نے میری پشت پر سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ مجھے ادب میں دوبارہ ڈاکٹر وزیر آغا لے آئے تھے اور ماہ نو میں انہیں کے مشورے سے میں نے غلام الثقلین نقوی کی افسانہ نگاری پر مضمون لکھا تھا اور انہیں دکھائے بغیر ماہ نو کو بھیج دیا تھا لیکن ظفر قریشی صاحب نے بطور مدیر اس تنقیدی مضمون کی خامیاں پہچان لیں اور پھر اشاعت سے پہلے اپنے مشوروں کی روشنی میں دوبارہ لکھوایا۔ ''ماہ نو'' میں ظفر قریشی کا عرصۂ ادارت زیادہ لمبا نہیں تھا۔ ان کی صحت

اچھی نہیں رہتی تھی ۔ دراصل آزادی کے بعد دہلی سے ہجرت کر کے کراچی آئے تو ان کی ادبی انجمن جسے ہر شام شاہد احمد دہلوی شام کو دفتر ''ساقی'' میں آراستہ کرتے تھے، بکھر گئی تھی۔ دہلی سے ہر خاندان فسادات کی آگ سے جان بچا کر بھاگا تھا۔ کوئی پہلے لاہور پہنچا۔ کوئی حیدرآباد اور کوئی کراچی میں سمندر کے راستے آ گیا۔ اور نئے وطن میں آتے ہی ہر ایک کو آبادکاری کے مسائل نے گھیر لیا۔ ان میں روزگار کی تلاش سب سے اہم مشق تھی۔ ظفر قریشی خوش قسمت تھے کہ انہیں ''ماہ نو'' کی ادارت مل گئی اور رہنے کے لیے پیر الٰہی بخش کالونی میں مکان بھی مل گیا جو ترک وطن کر کے کراچی میں آنے والوں کے لیے آباد کی گئی تھی۔ کراچی میں آباد ہو جانے کے باوجود دہلی کے چھوٹے جانے اور ادبی محفلوں کے بکھر جانے کا صدمہ ظفر قریشی کے دل میں گھاؤ بن گیا اور جب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے فرائض پوری دیانتداری سے ادا نہیں کر سکتے تو انہوں نے قبل از وقت ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے لی اور ملازمت کے بعد بھی وہ زیادہ دن نہ جئے اور 18 جولائی 1980ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن المناک بات یہ ہے کہ ملک کے دوسرے گوشوں میں کسی کو خبر نہ ہوئی کہ اردو ادب کی ایک سعید شخصیت اس دنیا سے اٹھ گئی ہے۔

لاہور میں فضل حق قریشی دہلوی تک یہ خبر اگست 1980ء کے وسط میں پہنچی۔ انہوں نے اپنا ٹیلی فون اٹھایا اور ''بنت قمر'' اور ''داستان سرائے'' کے مصنف صادق الخیری کو اطلاع دی جو اس جاں کاہ سانحے سے باخبر نہیں تھے۔

انہوں نے اپنے دوست اخلاق احمد دہلوی کو خط لکھا کہ ظفر قریشی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ اس وقت ریڈیو پر اخلاق احمد دہلوی اپنی سوانح حیات کا وہ باب سنا رہے تھے جس میں کمرخوں کی کھٹاس کا تذکرہ ہے۔ انہوں نے معمول کے پروگرام کو روک کر سامعین کو اطلاع دی کہ ''ماہ نو'' کے سابق ایڈیٹر اور ممتاز ادیب ظفر قریشی کو بھی سناونی آ گئی ہے۔ یہ پچھلے منگل کی بات ہے۔ اس وقت لاہور کے کمرخوں کے آخری شجر کے کٹ جانے کا ذکر ہو رہا تھا۔ اس ذکر

میں ظفر قریشی دہلوی کا ذکر بھی آ گیا کہ مرحوم لیموں کی کھٹاس کو کھٹاس شمار ہی نہیں کرتے تھے۔ وہ تو اس کھٹاس پر فریفتہ تھے۔ سو اب اس کھٹاس پر فدا ہونے والا بھی اس دنیا میں نہیں رہا۔ یہ وجود بھی زمین میں دفن ہو گیا۔

ایک بڑے ادیب ،ظفر قریشی دہلوی کی وفات کی خبر اخلاق احمد دہلوی کی خودنوشت سوانح کی ریڈیائی خواندگی میں گم ہو گئی۔ خدا جانے کتنوں نے سنی اور ملال کیا۔ خبر جلی حروف میں اور دو کالمی سرخی میں اخبار میں چھپتی تو شاید کوئی پوچھتا کہ ظفر قریشی کون تھے اور اے انور سدید، تمہیں اس کی موت کا صدمہ کیوں ہوا؟ اور اس پیکرِ خاک سے تمہارا کیا رشتہ تھا۔ میں حقیقتوں کے طلسم زیاں سے نکلوں تو عرض کروں کہ مرحوم سے میرا نام ونسب کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن جب میں نے اپنے بچپن میں ان کی لکھی ہوئی کہانیاں پڑھیں تو وہ مجھے رگ جاں سے زیادہ قریب محسوس ہوئے۔ انہوں نے میرے حواس پر اور اعصاب پر قبضہ جما لیا اور ان کی دھڑکنوں کا سلگتا ہوا الاؤ میرے تن بدن میں لو دینے لگا۔ میں نے اپنے بچپن میں ادب کے وسیلے سے جن لوگوں کی انگلی پکڑی ان میں ایک ظفر قریشی بھی تھے۔ وہ رسالہ ''ساقی'' دہلی میں کبھی طبع زاد افسانہ لکھتے جسے شاہد احمد دہلوی اپنے نوٹ سے چھاپتے تھے اور کبھی کسی بڑے افسانے کا ترجمہ کسی غیر ملکی رسالے سے کرتے لیکن انداز ایسا ہوتا کہ ترجمے کو تخلیق کا مقام مل جاتا۔ ان کے عہد میں جو ترجمہ نگار معروف ہوئے ان میں فضل حق قریشی اور صادق الخیری کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ میں ہندوستان کی راجدھانی دلی سے بہت دور سرگودہا میں آباد تھا لیکن رسالہ ''ساقی'' آتا تو یوں لگتا کہ سرگودہا۔۔۔ دلی کا ایک محلہ ہے اور ''ساقی'' نے جو محفل سجا رکھی ہے اس میں ظفر قریشی کے ساتھ میں بھی شریک ہوں۔ ظفر قریشی سے میرا یہی رشتہ تھا۔ وہ افسانہ نگار تھے اور میں ان کا ایک ادنیٰ قاری تھا۔ لیکن کیا اس سے بڑا رشتہ ادب کی دنیا میں موجود ہے؟ اور پھر گردش زماں ظفر قریشی کو اڑا کر نہ جانے کہاں لے گئی۔ اردو افسانے نے اچانک موڑ کاٹ لیا۔ کہانیاں پرچھائیوں میں اور کردار سایوں میں ڈھل گئے۔ میں اس نئے افسانے کا

بھی قاری تھا لیکن جو چاٹ کرخوں نے میرے منہ کو لگائی تھی، میں اس کو بھی یاد کرتا تھا۔ اور ہر افسانے کے عقب سے پلاٹ اور کردار تلاش کرنے کے لیے بے تاب ہو جاتا تھا۔ اردو افسانے کے اس بھنور میں ظفر قریشی کے فن کی مخصوص خوشبو گرچہ ماند پڑ گئی لیکن وہ میرے دل سے محو نہیں ہوئے اور پھر ایک روز ''ماہ نو'' کے سرورق پر ان کا نام رفیق خاور صاحب کے نام کے نیچے لکھا ہوا دیکھا تو حیرت ہوئی کہ ظفر قریشی کی کایا کلپ ہو چکی تھی اور وہ ''ماہ نو'' کے مدیر بن چکے تھے۔

''ماہ نو'' حکومت پاکستان کا رسالہ تھا جو آزادی سے قبل کے پندرہ روزہ رسالہ ''آج کل'' دہلی کی ساخت میں جاری کیا گیا تھا۔ سید وقار عظیم سے لے کر کشور ناہید تک اس رسالے کے مختلف برسوں میں مدیران رہ چکے تھے۔ ان میں ایک اہم نام ظفر قریشی دہلوی کا بھی تھا۔ اس زمانے میں میرا ان سے جو ذاتی تعلق پیدا ہوا اس کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ اور یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ دوسرے مدیران جرائد کی طرح ان میں دبدبہ سکندری نہیں تھا۔ وہ اپنے نئے لکھنے والوں کو مرعوب نہیں کرتے تھے۔ غلام الثقلین نقوی کے افسانوں پر ایک مٹی رنگے مضمون کے بعد میں نے ''اردو ادب کی دو فکری تحریکیں'' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ اس میں جن نظریات کے اظہار کی جسارت کی گئی تھی وہ ایک سرکاری پرچے کے مزاج کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ ظفر قریشی نے اس کی پرواہ نہ کی اور مضمون شائع کرنے کے بعد مجھے لکھا کہ یہ موضوع وسیع مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کو کتاب میں پھیلا دو تو بات بنے''۔ ظفر قریشی زیر خاک چلے گئے ہیں۔ میں انہیں کس طرح بتاؤں کہ میں نے ان کے ارشاد کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تھا اور اس موضوع پر کتاب لکھ کر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پی، ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔

ظفر قریشی ''ماہ نو'' کے مدیر تھے لیکن انہوں نے ماہ نو کو اپنی شخصیت سازی کے لیے بھی استعمال نہیں کیا۔ وہ خوشبو کی طرح اس کے ہر صفحے پر موجود ہوتے تھے لیکن ان کا وجود کسی لکھنے یا پڑھنے والے کو نظر نہیں آتا تھا۔ انہوں نے لکھنے والوں کا ایک حلقہ بنا لیا تھا جو ان کے تربیت یافتہ تھے۔ وہ اس حلقے کے ادیبوں کو نہ صرف ''ماہ نو'' میں وقار سے چھاپتے بلکہ انہیں ادب میں مستحکم

حیثیت دلانے اور ان کی انفرادیت کو تسلیم کروانے کی کوشش بھی کرتے، پہلے سے بہتر لکھی ہوئی تحریر کو اشاعت کے لیے قبول کر لیتے اور خط لکھ کر حوصلہ افزائی بھی کرتے۔ تحریر کم تر درجے کی ہوتی تو مسترد کر دیتے اور فرماتے، "یہ تحریر آپ کے معیار کے مطابق نہیں ہے۔ اس پر پھر نظر ڈال لیے۔" محسوس یہ بھی ہوتا ہے کہ انہیں کوئی تحریر مسترد کر کے خوشی نہیں ہوتی تھی اور مصنف کا موضوع پسند آ جاتا تو اسے موضوع کے نئے زاویے نکھارنے کی دعوت دیتے رہتے تھے۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ مصنف کا ارتقا جامد نہ ہونے پائے۔

ظفر قریشی کی خوبی یہ تھی کہ وہ لکھنے والوں سے محبت کا ذاتی رشتہ قائم کر لیتے تھے۔ میں نے جب بتایا کہ میں انجینئر نگ سکول سے سول انجینئر نگ کا امتحان پاس کر کے محکمہ آب پاشی پنجاب میں انجینئر بن گیا ہوں تو بہت خوش ہوئے اور مجھے لکھا:

"میرا ایک بیٹا این، ای، ڈی کالج سے انجینئر نگ کا کورس کر رہا ہے اور فرمان فتح پوری کا بیٹا انہیں کا ہم جماعت ہے۔" مقصد شاید یہ باور کرانا تھا کہ ہمارے ہاں ادب زندگی کا کفیل نہیں بنتا۔ اس لیے اسے پیشہ نہیں بنانا چاہیے۔ ذوق کی تکمیل شوق کے مدار میں رہے تو بہتر ہے۔" میں نے پوچھا "غلام الثقلین نقوی ایک پنجابی دیہات نگار ہے۔ ایک خاص خطے سیالکوٹ کے نواح کا افسانہ نگار ہے۔ وہ آپ کو کیوں پسند ہے؟" جواب میں لکھا "غلام الثقلین نقوی کے ہاں جو معصوم صداقت ہے، میں اس کا گرویدہ ہوں۔ وہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی پاسبانی کرتے ہیں اور ان کے افسانے پورے ہندوستانی دیہات کے نمائندہ ہیں۔ وہ محدود نہیں، پریم چند کی طرح لامحدود ہیں اور وہ مجھے اپنے قبیلے کا فرد نظر آتے ہیں۔"

میں نے ایک مرتبہ اپنے کسی خط میں مظہر انصاری صاحب کا ذکر کیا کہ انہوں نے مجھے میری ادبی زندگی کی ابتداء میں "ہمایوں" میں شائع کر کے بڑا اعتماد عطا کیا تھا۔ جواب میں لکھا

''مظہر انصاری نے تم پر احسان نہیں کیا۔تمہارا احسان مظہر انصاری پر ہے کہ اُسے ''ہمایوں'' کے معیار کا مواد فراہم کرتے رہے'' اعتراف حقیقت کے طور پر عرض ہے کہ میں ظفر قریشی صاحب سے متفق نہ ہو سکا اور مظہر انصاری صاحب کے احسانات کو کبھی بھلا نہ سکا۔ بلاشبہ وہ میرے محسن مدیر تھے ۔آخری دور میں جب ظفر قریشی نے علالت کی وجہ سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کا ارادہ کرلیا۔۔۔''تو ان پر قدرے پژمردگی طاری رہنے لگی۔ خطوط میں اکثر ذکر کرتے کہ اب ''ماہ نو'' کے لکھنے والے نقوش ۔''ادبی دنیا اور فنون'' میں چھپنے لگے ہیں اور مجھے اور ''ماہ نو'' کو نظر انداز کرنے لگے ہیں۔اتنی بھرپور ادبی زندگی گزارنے کے بعد مجھے تنہائی کاٹ رہی ہے۔''

واقعی، ظفر قریشی ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ زیادہ عرصہ نہیں جیئے۔ شاید انہیں تنہائی اور ان لکھنے والوں کا رویہ چاٹ گیا تھا جن کو انہوں نے آسمان ادب کا ستارہ بنا دیا تھا۔محکمہ آبپاشی میں انجینئرنگ کی ملازمت کے دوران میں بھی ادب اور ''ماہ نو'' سے کٹ گیا تھا لیکن ظفر قریشی دہلوی مجھے اکثر یاد آتے تھے۔ بلاشبہ وہ میرے محسن ایڈیٹر تھے۔
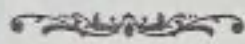
عبدالعزیز خالد

28 جنوری 2010ء کی دوپہر کو شجرِ سخن سے ایک پتہ اور گر گیا۔ اور یہ عبدالعزیز خالد تھے جن کی ایک تازہ طویل نظم میں نے ماہنامہ "الحمرا" کے سالِ نو کے پہلے شمارے میں پڑھی تھی جس کا عنوان ہے "مقدر ہے کیا ہر سخنور کا احساسِ محرومی و ناتمامی"۔۔۔ اس عنوان کے تحت انہوں نے اردو شاعری کے تین نابغوں۔۔۔ اقبال، میر انیس اور غالب کا منظوم تجزیہ کیا تو اپنا قولِ فیصل ان الفاظ میں پیش کر دیا۔

"یہ ہے تین ان نابغوں کا ماجرا
جن کے دم سے دائما نوآفریں ہنگامہ ءحرف و نوا
جن سے ہے اردو ادب کی آبرو"

ڈاکٹر انور محمود خالد نے ان کی وفات کی خبر دی تو دل دھک سے رہ گیا کہ اردو شاعری کو عظمت نشان بنانے والا شاعر جس کے تمام انداز کریمانہ تھے، اچانک اس بزمِ جہاں سے اٹھ گیا تھا۔ میں نے الحمراء کا جنوری 2010ء کا شمارہ کھول کر ان کی نظم پڑھنی شروع کی تو یوں محسوس ہوا کہ وہ کسی اور کی بات نہیں کر رہے تھے، خود اپنے بارے میں کہہ رہے تھے۔

"بس کہ قدرت نے کیا تھا، تجھ کو پیدا ہی، فقط تخلیق کاری کے لیے
دل نگاری کے لیے، اختر شماری کے لیے
اشک ہائے لالہ گوں سے کشت زار فکر و فن کی آبیاری کے لیے
حرف ہائے تازہ وافکارِ نو کی نخل کاری کے لیے
اور پیچاک طلسم پیچ مقداری سے ابنائے وطن کی رستگاری کے لیے"

لیکن آج:

''خاموش ہو گیا تھا چمن بولتا ہوا''

اور رات اترنے سے پہلے اس سخن کے تاجدار ، نامور وار جمند شاعر کو لحد میں اتار دیا گیا سینکڑوں نمیدہ آنکھیں دعا بہ لب تھیں۔

''آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے''

عبدالعزیز خالد سے میرا پہلا تعارف 1944ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں ہوا تھا۔ وہ میٹرک کے امتحان میں پنجاب یونیورسٹی میں دوئم آئے تھے اور عمرانی علوم کی تحصیل کے لیے جالندھر سے لاہور آئے تو ان کا ہاسٹل کا کمرہ چند دنوں میں ہی عربی ، فارسی ، اردو اور انگریزی کی کتابوں سے بھر گیا۔ عبدالعزیز خالد فرسٹ ایئر کے طلباء میں کچھ زیادہ معروف نہیں تھے لیکن ایک واقعے نے سب کی توجہ ان کی طرف مبذول کرا دی۔ اور یہ واقعہ ان کے کمرے سے کتابوں کی چوری کا تھا۔ ان کی کتابوں کا چور سائنس کا ایک طالب علم مظہر علی تھا جو اپنی واردات چھپا نہ سکا اور پکڑا گیا۔ معاملہ پرنسپل ڈاکٹر عمر حیات ملک صاحب تک پہنچا تو امکان فوراً یہ تھا کہ وہ اسے عبرت ناک سزا دیں گے۔ عبدالعزیز خالد کی موجودگی میں اس چوری کی وجہ پوچھی گئی تو مظہر علی نے جواب دیا:

''سر، میں اپنی ذاتی لائبریری بنانا چاہتا تھا۔''

عبدالعزیز خالد اس وقت نو عمر طالب علم تھے، یہ جواب سن کر ان کی غنی مزاجی عود کر آئی۔ انہوں نے مظہر علی کو سزا سے بچانے اور اس کے مستقبل کو تحفظ دینے کی کوشش کی اور پرنسل صاحب سے کہا:

''سر، میں اب اپنی کتابیں مظہر علی سے واپس نہیں لینا چاہتا بلکہ پیشکش کرتا ہوں کہ اپنی لائبریری کیلئے مزید کتابیں لینا چاہے تو پسند کر لے۔''

پرنسپل صاحب اس جواب سے اتنے متاثر ہوئے کہ تادیبی کارروائی کے برعکس مظہر علی کو کالج تبدیل کر لینے کے حکم پر اکتفا کیا..... لمبے عرصے کے بعد جب عبدالعزیز خالد محکمہ انکم ٹیکس

لاہور میں کمشنر بن کر آ گئے تو ایک ملاقات میں اس واقعے کا میں نے ذکر کیا۔ بڑی سادگی سے بولے" آپ کو پتہ ہے مظہر علی اب حکومت پاکستان کے اونچے درجے کے افسر ہیں اور وطن عزیز کی اعلیٰ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی دیانت کی سب لوگ تعریف کرتے ہیں"۔ ان کی اس بات سے یہ نتیجہ میں نے اخذ کیا کہ متذکرہ واقعہ نے مظہر علی کی زندگی کی کایا پلٹ دی تھی۔ اور ان کے اندر دیانتدار انسان کو بیدار کر دیا تھا۔

اسلامیہ کالج لاہور کا ذکر چھڑا ہے تو مجھے یاد آ رہا ہے کہ قاسم رضوی، محمد حسین شمیم، مجید نظامی، ارشاد احمد حقانی، سرتاج عزیز جیلانی کامران، سلیم فاروقی، شجاع الدین، ناصر کاظمی اور رضی ترمذی اس دور میں ممتاز طلباء میں شمار ہوتے تھے۔ لیکن عبدالعزیز خالد اپنی ذات میں سمٹے سمٹائے رہتے تھے۔ اور کالج کی بعید از نصاب سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ ان کا خصوصی امتیاز یہ تھا کہ فارسی کے استاد رفیق خاور صاحب ہوسٹل میں ان کے کمرے میں گھنٹوں بیٹھتے اور ادب کے مختلف موضوعات پر ان سے تبادلہء خیالات کرتے اور کلاس میں ان کا ذکر کرتے تو تعریف میں رطب اللسان ہو جاتے۔ انہوں نے یہ بات بتائی تھی کہ خالد صاحب نے عربی زبان میں اتنی استعداد حاصل کر لی ہے کہ "سبع معلقہ" کے مفاہیم کی تشریح کر سکتے ہیں اور عربی میں شاعری بھی کرتے ہیں۔" جب میٹرک میں تھے انہوں نے ایک نظم رسالہ "ہمایوں" میں بھیجی۔ ایڈیٹر یوسف ظفر نے یہ کہہ کر نظم واپس کر دی کہ "ہمایوں" عربی کا نہیں اردو کا رسالہ ہے۔ اردو میں نظم بھیجیے۔"

اسلامیہ کالج لاہور سے عبدالعزیز خالد نے ایف، اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ عمرانیات کے سب مضامین میں وہ اول آئے تھے۔ ہر مضمون میں میڈل حاصل کیا تھا۔ اس برس (1946) قائداعظم اسلامیہ کالج آئے تو حبیبیہ ہال میں طلباء میں انعامات بھی انہوں نے ہی تقسیم کیے۔ خالد صاحب کئی مرتبہ اپنا انعام لینے کے لیے اسٹیج پر آنے لگے تو قائداعظم یہ کہے بغیر نہ رہ سکے:

''ذہین نوجوان، کچھ انعامات دوسرے لڑکوں کے لیے بھی چھوڑ دو......

سارے انعام خود نہ لے جاؤ گے۔''

عبدالعزیز خالد 15 جنوری 1927ء کو نکودر کے گاؤں ''پرجیاں کلاں'' (جالندھر) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم ٹاٹ کے سکول میں حاصل کی۔ ان کے والد جناب شاہ محمد سکول میں مدرس تھے۔ اپنے بیٹے خالد کے رجحان کے مطابق ان کی عربی کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ ابتدائی تعلیم کے دوران ہی ان کا رخ شاعری کی جانب مڑ گیا اور انہوں نے ''سبع معلقہ'' عربی شعرا کو نہ صرف رغبت سے پڑھا بلکہ ان کے اثرات بھی قبول کیے اور الفاظ کا بے شمار ذخیرہ اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ ان کے دینی رجحانات کی پرورش بھی گھر کے صحت مند اخلاقی ماحول میں ہوئی، اسلامیہ کالج لاہور میں انہیں پروفیسر علم الدین سالک، پروفیسر حمید احمد خان اور پروفیسر رفیق خاور کی خصوصی سرپرستی حاصل ہوئی۔ کالج کے رسالہ ''کریسنٹ'' کے ایڈیٹر بنائے گئے۔ ایم اے اکنامکس (اقتصادیات) کے مضمون میں کیا اور 1950ء میں مقابلے کا امتحان دے کر ''انکم ٹیکس سروس'' میں آ گئے۔ انہوں نے 1971ء تک کراچی میں خدمات انجام دیں اور پھر لاہور آ گئے۔ جنوری 1987ء میں ریٹائر ہوئے تو وہ انکم ٹیکس کمشنر کے عہدے پر کئی برس خدمات ادا کر چکے تھے، اور اس محکمے میں ان کی دیانت، امانت، کارکردگی اور حسن سلوک کا سکہ بیٹھ چکا تھا۔

سرکاری ملازمت عبدالعزیز خالد کی گزراوقات کا وسیلہ تھی۔ ان کا عشق شاعری سے تھا اور اس میں انہوں نے اتنی قدرت حاصل کر لی تھی کہ علمی اور فکری موضوعات کو بھی نثر کی بجائے نظم میں کہنے میں آسانی محسوس کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ان سے ایک مرتبہ ماہنامہ ''اردو زبان'' کے لیے جس کا میں پس پردہ مدیر تھا۔ اپنا ''ادبی نقطۂ نظر'' بیان فرمانے درخواست کی۔ خالد صاحب نے اپنا اظہار نثر کی بجائے رباعی کی صنف میں کیا۔ میں نے یہ رباعیات شائع کیں تو انہیں عبدالعزیز خالد کا ادبی ''مینی فیسٹو'' قرار دیا۔ اکثر اوقات لوگ ان کے تجربات علمی پر حیرت کا اظہار کرتے کہ انہیں ہندی، سنسکرت، یونانی اور عبرانی میں بھی عمل دخل حاصل تھا اور شاعری

میں ان زبانوں سے استفادہ کرتے تو باوزن جملوں کو حسب ضرورت استعمال کرنے میں تامل نہ کرتے لیکن فوقیت ہمیشہ عربی زبان کو دیتے جس کے الفاظ تشبیہات، استعارات اور تلمیحات سے انہیں کماحقہ، آگہی تھی۔ ان کا یہ تخلیقی وفور ان کی طویل نظموں اور منظوم تمثیلوں کے علاوہ غزل میں بھی ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عربی زبان کے استعمال عام کو اپنی جڑوں تک پہنچنے کی کاوش قرار دیتے تھے۔ انتظار حسین سے باتیں کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ ''ان (عربی) لفظوں کی مدد سے میں تہہ میں جا کر ماضی سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں'' ان کی نظر میں:

> ''اس ام الالسنہ میں وہ جوامع الکلم محفوظ ہیں جو امت مرحومہ کے لیے حیات نو کی نوید ہیں۔ خدا کے آخری پیغام کی حامل بھی یہی زبان ہے۔ اس کے توسط سے ہم ارمغان حجاز وصول کر سکتے ہیں۔''

(بحوالہ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد ''اردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی سفر''۔ ص 243)

شاعری میں مختلف زبانوں کے الفاظ و علامات کا استعمال عبدالعزیز خالد کا معمول تھا اور ان پر غیب سے مضامین اترتے تو یہ سب ان کی فطری تخلیق کاری کا جزو ہوتے لیکن عوام کے لیے...... جن کے علم کی وسعت بے کراں نہیں بلکہ محدود ہے، ان کی شاعری مشکل گوئی کا نمونہ بن جاتی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ خیال درست ہے کہ ''عبدالعزیز خالد نے جس معاشرے میں اپنی تخلیقی کارکردگی کا مظاہرہ کیا، وہ معاشرہ بھی ان کی تحلیقات کے تناظر سے پوری طرح آگاہ نہیں تھا۔ اسی لیے وہ شاعری کے میدان میں ہر دلعزیزی کو چھو نہ سکے، لیکن ان کے کلام میں ایک بڑی تعداد ایسے شعار کی بھی ہے کہ انہیں اگر الگ طور پر شائع کر دیا جاتا تو ان کی بڑی شاعری کے شواہد ان کے ایک عام قاری کو بھی مل جاتے۔''

اب یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے، خالد صاحب کی ''مشکل پسندی'' اور ''آسان گوئی'' کی چند مثالیں پیش کر دی جائیں۔

مشکل گوئی

اِنی اخشی ، ان یکون بی نعم
ہے مری خو بو زمانے سے الگ

یعنی رہن زنداں جوع و رخص و علا
سب ہیں آلودۂ ہوس...........

حنظل و تمر و ترنج و ریحان
سبد سود و زیاں میں انسان

آسان گوئی

رنج گراں کے بوجھ سے تارے بھی تھک گے
اس ظلمت فراق کی شاید سحر نہیں
کتر دیے ہیں زمانے نے پنکھ خوابوں کے
بھرا ہے ساغر حسرت میں آرزوؤں کا خوں
یوں سرشام دریچے میں تو استادہ ہے
قرص خورشید ہو مشرق سے نمایاں جیسے

عبدالعزیز خالد کی شاعری میں حمد ونعت کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے افراط وتفریط سے بچ کر موضوع کی عظمت، اہمیت اور نزاکت کو ملحوظِ خاطر رکھا اور ختم الرسلؐ کے جمال وکمال، سیرت وصفات اور پیغامات عالیہ کو نعت میں پیش کیا تو فارقلیط' طاب طاب، عبدہٗ، تحمنا، حمطایا اور ماذ ماذ جیسے مجموعے تالیف ہو گئے اور یہ فہرست بھی مکمل نہیں۔ نظم اور غزل کے مجموعوں میں مجھے اس وقت کف دریا، ورق ناخواندہ، حدیث خواب، کلک موج، سراب ساحل اور زنجیر رم آہو یاد آ رہے ہیں۔ عبدالعزیز خالد نے ایک پوری کتاب جاپانی ہائیکو کے تراجم پر شائع کی تھی۔

'غبار شبنم'' کے نام سے جاپانی نظموں کا اور ''پرواز عقاب'' کے نام سے چینی نظموں کا ترجمہ پیش کیا۔ دکان شیشہ گر میں منظوم ڈرامے ہیں۔ میں نے ان کے دو شعری مجموعے ان کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے بھی دیکھے ہیں اور یہ یوں لگتے ہیں جیسے کوئی پیشہ ور کاتب روانی قلم

سے لکھ رہا ہو۔ صحت الفاظ اور تلفظ کی طہارت کے لیے وہ جوش ملیح آبادی کی طرح اعراب کا استعمال ضروری سمجھتے تھے۔ اخبارات، رسائل اور کتب میں کتابت کی غلطیاں دیکھتے تو ان کی طبیعت پر بوجھ پڑ جاتا تھا۔

عبدالعزیز خالد پر کامل القادری نے ''مبہمات خالد''...... حسین سحر نے ''خالد...... شخص وشاعر'' اور وفا راشدی نے ''خالد..... ایک نیا آہنگ'' کے عنوانات سے تنقیدی کتابیں لکھی ہیں۔ حفیظ صدیقی نے رسالہ ''تحریریں'' کا عبدالعزیز خالد نمبر تین ضخیم جلدوں میں شائع کیا۔ قدیر شیدائی نے ''فانوس'' کا اور حفیظ الرحمان احسن نے ''سیارہ'' کے خصوصی نمبر اس عظیم شاعر پر شائع کیے۔ ان سب کے ساتھ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی کتاب ''ارمغان خالد'' کا ذکر بھی ضروری ہے کہ گیارہ سو صفحات کی اس جیسی کتب بہت کم شاعروں پر شائع ہوئی ہوں گی۔ شخصی زاویے سے ان جیسا منسکر المزاج، عالی فطرت اور درویش شاعر اس دور میں نظر نہیں آتا۔ صدر پاکستان نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے لیے انہیں صدارتی ایوارڈ دینا چاہا تو عبدالعزیز خالد نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اب اس محفل سے اٹھ گئے ہیں تو یہ محفل سونی نظر آرہی ہے۔

ان کی رحلت اردو ادب کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت کرے!

ڈاکٹر عبدالمغنی

پروفیسر عبدالمغنی جنہوں نے 5 ستمبر 2006ء کو پٹنہ (بھارت) میں داعی اجل کو لبیک کہا تھا اردو کے ایک عظیم ادب شناس دانشور، نقاد اور ''مطالعہ اقبال'' کے عالمی شہرت یافتہ ادیب تھے۔ حادثۂ قلب سے انہوں نے وفات پائی تو ان کی عمر 70 برس تھی اور وہ ادبی سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور اقتصادی موضوعات پر سینکڑوں مضامین لکھ چکے تھے، وہ اسلامی نظریات کے علمبردار اور ہندوستان میں اردو زبان کے بے باک ترجمان تھے۔ بھارت کی متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے اپنی زندگی ہندوستان میں ''اردو زبان'' کے تحفظ اور اردو ادب کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی، وہ ایک طویل مدت تک انجمن ترقی اردو بہار کے صدر رہے اور شام کے وقت انجمن کے دفتر میں باقاعدگی سے بیٹھتے تھے۔ ان کی کوششوں سے بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا۔ وہ بنیادی طور پر انگریزی کے پروفیسر تھے اور انہوں نے پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی میں لمبے عرصے تک اعلیٰ خدمات انجام دیں۔ یہ ان کی مساعی اور تعلیم و تعلم کا ہی نتیجہ ہے کہ آج بھارت کے تمام صوبوں کے مقابلے میں اردو میں صوبہ بہار، تصنیف و تالیف اور ادب و صحافت کے اعتبار سے سب سے آگے ہے۔

اردو ادب میں پروفیسر عبدالمغنی کی بنیادی حیثیت ایک ایسے نقاد کی تھی جس کی سوچ کے اپنے منفرد پیمانے تھے۔ وہ ادب کے نظریاتی مباحث میں صرف اپنے پیمانوں پر انحصار کرتے، دوسروں کی رائے کا احترام کرتے، ان کے موقف کو دلائل سے مسترد کرتے، اور اس ''مجادلے'' میں اپنے موقف کی صداقت ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ وہ پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے لاہور میں بھی قدم رنجہ فرمایا۔ پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں ان کے ساتھ ایک شام منانے کا اہتمام کیا گیا۔ مغنی صاحب نے پاک و ہند کے اردو ادب پر ایک سیر حاصل

فی البدیہہ تقریر کی اور پاکستان کے ادیبوں کے نام اور کام کا تذکرہ اس افراط سے کیا کہ شرکائے مجلس ان کے مطالعے کی وسعت پر حیرت زدہ رہ گئے۔ اس تقریب میں ہی انہوں نے علامہ اقبال کا شمار دنیا کے عظیم ترین شعراء میں کیا تو ایک ''اقبال شناس'' نے نکتہ اعتراض اٹھایا ''کیا آپ نے دنیا کے سب عظیم شاعروں کو پڑھا ہے؟'' اور مغنی صاحب نے انکساری سے جواب دیا'' میں سب عظیم شاعروں کو پڑھنے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن انگریزی کے حوالے سے میں نے دنیا کا جتنا عظیم ادب پڑھا ہے اقبال اس میں وقیع مقام رکھتے ہیں۔'' اس وقت مجھے ان کے صحیح الفاظ تو یاد نہیں آرہے لیکن ان کا مفہوم میرے ذہن میں واضح ہے انہوں نے اقبال کی برتری ثابت کرنے کے لیے ان کے'' زمانے'' کو اہمیت دی تھی اور کہا تھا کہ اقبال نے مفکرین عالم کا مطالعہ کیا، ان سے استفادہ بھی کیا اور پھر ان سے آگے بڑھنے کی کاوش بھی کی۔ ان کی روشنی کا ماخذ قرآن حکیم تھا جس سے بیشتر عالمی شہرت یافتہ شاعروں نے استفادہ نہیں کیا اور وہ دانش کے اس آسمانی ماخذ سے محروم رہ گئے، اقبال نے ان سب پر فوقیت حاصل کر لی۔۔۔ مغنی صاحب کے اس مدلل جواب کے بعد فاضل معترض کے پاس کچھ اور کہنے کی گنجائش باقی نہ رہی۔ اور ایک نقاد نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ پاکستانی ادیب کے اس سوال سے بھارت کے ایک معتبر ادیب، دانشور اور نقاد کا ایسا بیان حاصل ہو گیا ہے جو آئندہ حوالے کے طور پر استعمال ہو گا۔ پروفیسر عبدالمغنی نے سنا تو کہا'' یہ محض بیان نہیں، میرا پختہ یقین ہے جو مطالعہ اقبال کا حاصل ہے۔''

مغنی صاحب کے اس موقف کے ثبوت میں ان کا مقالہ'' تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ'' (مطبوعہ۔ ماہنامہ'' سیارہ'' شمارہ 46۔ دسمبر 2000) پیش کیا جا سکتا ہے جو تمام کا تمام فکر اقبال کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے اور سوویت یونین کے انہدام کے بعد جب امریکہ نے ایک نئے عالمی نظام کو متعارف کرانے کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا تو مغنی صاحب نے لکھا ''۔۔۔ ایک عالمی تہذیب۔۔۔ کی تشکیل و ترقی کی کوشش کم از کم پچھلی دو صدیوں سے ہو رہی ہے۔ انیسویں صدی میں یورپ کے سامراج کی نو آبادیاتی فتوحات کا یہی مقصد تھا۔ بیسویں

صدی میں امریکی سرمایہ داری اور روسی اشتراکیت کا مطمع نظر بھی یہی تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد
''لیگ آف نیشنز'' اور دوسری جنگ عظیم کے بعد یونائیٹڈ نیشنز کے محرکات میں قیام امن کے
دعوے کے ساتھ ساتھ اتحاد انسانیت کا نعرہ بھی تھا۔ اب نیو ورلڈ آرڈر سے امریکہ کی مراد بھی
ایک عالمی تہذیب ہے۔''

علامہ اقبال 1938ء میں وفات پا گئے تھے اس وقت امریکی سرمایہ داری اور روسی
اشتراکیت نے نئے عالمی نظام کا جو خواب دیکھا تھا، اس کے آثار زیادہ نمایاں نہیں ہوئے تھے
لیکن یہ دونوں نظام اپنی برتری کے دعوے کر رہے تھے اور اپنی اپنی جغرافیائی حدود سے باہر یلغار
کر رہے تھے۔ پروفیسر عبدالمغنی کا مشاہدہ یہ تھا: ''اقبال تاریخ کے رجحانات سے بخوبی واقف تھے
اور حال سے بڑھ کر مستقبل کے افق پر بھی بہت دور تک دیکھ رہے تھے۔ وہ مغرب کے دعوے
اور نعرے کو بالکل کھوکھلا سمجھ رہے تھے اس لیے کہ وحدت انسانی کی کوئی نظریاتی بناوٹ یورپ اور
امریکہ کے سیاستدانوں اور فلسفیوں کے پاس نہیں تھی۔ وہ سب کے سب علاقائی، نسلی اور طبقاتی
کشمکش میں ذہنی اور عملی طور پر مبتلا تھے ان کے سامنے صرف اپنا معاشی مفاد اور اس پر مبنی سیاسی
نقطۂ نظر تھا۔ ان کے مدنظر کوئی ایسا اخلاقی اصول تھا ہی نہیں اور اب بھی نہیں ہے جو پوری انسانیت
کو متحد کرنے والا کوئی تہذیبی نظریہ دنیا کے سامنے رکھ سکے۔'' مغنی صاحب علامہ اقبال کو دور
غلامی کا ایک دور بین مفکر اور اپنے وقت کا سب سے تعلیم یافتہ شخص تسلیم کرتے تھے جس کے
مطالعات، مشاہدات اور تجربات عالمی سطح کے تھے۔ اس کا تفکر آفاقی تھا اور تصور بین الاقوامی۔ وہ
ایک عظیم فلسفی تھا، سیاستدان بھی اور دنیا کا عظیم ترین شاعر بھی۔ تہذیبوں کے تقابلی مطالعے
میں پروفیسر مغنی نے اقبال کے بنیادی تصورات کو حسب ذیل ترتیب سے پیش کیا ہے:

اول: عصر حاضر کے لیے ایک جدید تہذیب ضروری ہے۔

دوم: یہ تہذیب آفاقی ہونی چاہیے۔

سوم: اس تہذیب کا منبع مشرق ہی ہو سکتا ہے۔

چہارم: یہ منبع اسلام کا تہذیبی نظریہ ہے۔

پنجم: یہ نظریہ ہی ''انسان بحیثیت انسان'' کی انتہائی ہمہ جہتی اور متوازن ترقی کا ضامن ہوسکتا ہے۔ اسلام کی تہذیبی قدروں کے حوالے سے مغنی صاحب نے متعدد اشعار اقتباس کیے ہیں۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں:

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی　　اخوت کی جہانگیری ، محبت کی فراوانی
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب　　پادشاہوں کی نہیں ، اللہ کی ہے یہ زمیں
تمیز بندہ و آقا ، فساد آدمیت ہے　　حذر اے چیرہ دستاں، سخت ہیں فطرت کی تعزیریں
مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام　　جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم

''مغربی تہذیب'' پر اقبال کے تبصرے کی جو حقیقت ''طلوع اسلام'' میں پیش کی گئی وہ آج کے حالات میں بھی مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔

ابھی تک آدمی صید زبون شہر یاری ہے　　قیامت ہے کہ انساں، نوع انساں کا شکاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندان مغرب کو　　ہوس کے پنجہ خونیں میں تیغ کارزاری ہے

علامہ اقبال پروفیسر عبدالمغنی کے مطالعے کا مستقل موضوع تھا، انہوں نے اقبال کے فکر وفن پر متعدد کتابیں لکھیں۔ مضامین رقم کیے، تقریری مباحثوں میں شرکت کی اور تصورات اقبال کے متعدد زاویوں کو روشن کیا۔ علامہ اقبال پر ان کی چند کتابوں کے عنوانات یہ ہیں: ''اقبال اور عالمی ادب''، ''اقبال کا نظام فن''، ''نقطہ نظر۔۔۔ تنویر اقبال''۔ ''اقبال کا ذہنی ارتقا''، ''شاعر اقبال'' (انگریزی)۔

ڈاکٹر عبدالمغنی ایک جامع الحیثیات نقاد تھے، وہ مشرق کے ان مکینوں کو حیرت کی نظر سے دیکھتے تھے جن کا دل مغرب میں جا اٹکا تھا، اپنے راسخ موقف کے تحت وہ مشرق کے ادیبوں کے فن کے محاسن اجاگر کرتے تو مغرب کے ادیبوں کو نیچا دکھانے کی کوشش بھی کرتے۔ مثال کے طور پر انہوں نے مولانا شبلی نعمانی کی تنقید نگاری کا تجزیہ کیا تو ان کی تنقیدی دستاویز ''شعر العجم'' کو

مخصوص ادبی تصورات کے مطابق عملی تنقید کا نمونہ قرار دیا ہے۔ ''موازنہ انیس و دبیر'' کو ایک پوری صنف سخن (مرثیہ) کی ایسی علمی تنقید تسلیم کیا جس کی نظیر دنیائے ادب میں مفقود ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا: ''شبلی دنیا کے پہلے نقاد ہیں جنہوں نے اس پیمانے پر عملی تنقید کا بہترین نمونہ پیش کیا جبکہ انگریزی میں عملی تنقید کے امام آئی۔اے۔رچرڈز کا نام بہت بعد کا ہے۔۔۔۔۔۔ آئی۔اے۔رچرڈز کے تنقیدی تصورات اس کی زندگی کے مختلف ادوار میں بدلتے رہے اور آخر تک یہ معمہ حل نہ ہوا کہ وہ لفظ و معنی میں کس کی اہمیت کا زیادہ قائل تھا۔اس لیے اس کے تنقیدی بیانات میں کافی تضاد ہے۔۔۔زمانے کے لحاظ سے عملی تنقید کے معاملے میں شبلی رچرڈز کے پیش رو ہیں۔'' (رسالہ ''مریخ''، پٹنہ جنوری فروری 2001 ص5)

اس مقالے میں انہوں نے اردو کے جدید ترین ناقدوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ رچرڈز سے پہلے اور زیادہ شبلی کا مطالعہ کریں کیونکہ ان کی رائے میں: ''تب ہی ان پر مشرقی اور آفاقی تنقید کے راز کھل سکیں گے، نیز انہیں اپنی تنقیدی روایات کی گراں مائیگی کا احساس ہوگا، جس کے بغیر وہ ایک خلاء میں معلق ہیں اور بے جڑ کے پودے بن گئے ہیں۔'' (حوالہ۔ایضا)

ڈاکٹر عبدالمغنی بلاشبہ ایک راسخ الاعتقاد نقاد تھے اور ڈاکٹر وہاب اشرفی نے ان کی تنقید کی جہت نمائی کی تو لکھا کہ ''پروفیسر عبدالمغنی نے اسلامی ادب کو اپنی تنقید کا جزو خاص بنا رکھا ہے۔۔۔وہ اسلامی فکر کی گود میں پرورش پانے والی اخلاقات کو ادبی فن پاروں کی لازمی خصوصیت قرار دیتے رہے'' لیکن انہوں نے ادب کو تبلیغ کا وسیلہ نہیں بنایا اور ادب کو فن کے پیمانوں سے پرکھنے پر زور دیا۔زبان و ادب کے بارے میں ان کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ان کے وسیع تر نظریات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

> ''شعریت شاعری نہیں ہے۔شعریت تو انسانی احساسات کے علاوہ قدرتی مناظر میں بھی پائی جاتی ہے۔مگر شاعری اظہار و بیان کی ایک خاص ہیئت کا نام ہے۔جس کے قواعد و ضوابط مقرر ہیں۔ان قواعد و ضوابط کو عربی، فارسی، اور

اردو میں عروض کہا جاتا ہے۔۔۔ عروض صنائع و بدائع سے بھی الگ اور مستقل بالذات ہیں۔۔۔شاعری کے یہ اصول نغمے کے اس آہنگ پر مبنی ہیں جس کو عام طور پر موسیقی کہا جاتا ہے۔''

''زبان ایک سماجی پس منظر میں پروان چڑھ کر فطری طور سے نمودار ہوتی ہے اور اپنا ایک سانچہ بنالیتی ہے۔ چنانچہ اردو انگریزی نہیں بن سکتی اور انگریزی اردو نہیں بن سکتی۔''

''محض شعریت کا اظہار فقط ادب لطیف ہے جو نثر میں بھی ہوسکتا ہے۔''

''زندگی اور فن کا باہمی رشتہ دونوں کی مضبوطی کا باعث ہے۔لہٰذا اسے استوار رکھنا ایک ادبی فریضہ ہے۔''

''عصری احساسات کی ترجمانی تہذیبی اقدار کو مدنظر رکھ کر ہونی چاہیے تاکہ معاشرے کی سالمیت پر آنچ نہ آئے۔''

مجموعی طور پر ڈاکٹر مغنی ادب میں اخلاقی نقطۂ نظر کے فروغ کے حامی تھے اور وہ اصناف ادب کی ہیئتوں کو اپنے مخصوص و معین سانچوں میں قائم رکھنے پر زور دیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ''آج کی اردو شاعری میں آزاد نظم، آزاد غزل اور نثری شاعری کو کوڑا کرکٹ کا ڈھیر'' کہنے سے گریز نہ کیا۔ تجریدی افسانہ نگاری کو ایک ایسی رو قرار دیا جو مغرب کی خام نقالی میں چلی تھی۔ انہوں نے کہا کہ ''بے ماجرا کہانی لطیفہ گوئی سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ علامتی افسانہ بھی تجریدی افسانے کی ایک پراسرار شکل ہے اور تجریدی علامت نگاری ایک قسم کی معمہ بازی ہے جس کا کوئی انعام پڑھنے والے کو نہیں ملتا'' اور پریم چند اور قرۃ العین حیدر کو عالمی ادب میں اپنی اپنی مخصوص جگہ پر دانشوری کی روایات کے مینار قرار دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے تجریدی علامتی افسانے اور ناول لکھنے کی بجائے ٹھوس باماجرا ناول اور افسانے لکھے تھے جو حقیقت کو اپنے اصلی اور فطری رنگوں میں پیش کرتے تھے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر

عبدالمغنی نے جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات اور پس ساختیات وغیرہ کے مباحث کو سرے سے مصنوعی قرار دیا کیونکہ ان کی رائے میں یہ مباحث مغرب کی کورانہ تقلید پر مبنی ہیں اور ان کا مقصد اسٹنٹ یا ریکٹ چلانا ہے۔جس سے ادب کی فضا خراب ہوتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی نے ادب کے متنازع موضوعات کو''انجمن ترقی اردو بہار'' کے ترجمان رسالہ''مریخ'' میں جس کے وہ بانی مدیر تھے کشادہ ظرفی سے شائع کیا۔انہوں نے مریخ کی ادارت زندگی کے آخری لمحے تک قریبا25 برس کی۔اور اسے اردو زبان وادب کے صحت مند مباحث ابھارنے کے علاوہ اردو کو ہندوستان میں اس کا گم شدہ سماجی اور تہذیبی و تعلیمی منصب دلانے کی تحریک کا ترجمان اور نمائندہ رسالہ بنائے رکھا۔افسوسناک بات یہ ہے کہ ترقی پسند اور جدیدیت نواز ادیبوں نے ڈاکٹر عبدالمغنی کے خیالات کو موضوع بحث نہیں بنایا بلکہ مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ ان کا''بائیکاٹ'' کردیا۔چنانچہ ان کا نام اور کام اسلامی ادب کے رسائل کے سوا کہیں نظر نہیں آتا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک نظریہ ساز نقاد تھے اور اپنے نظریات کا خود دفاع کرتے تھے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی وفات سے ادب کا ایک اور روشن چراغ بجھ گیا، ادب کی دنیا میں تاریکی اور بڑھ گئی ،انہیں اورینٹل کالج لاہور کے شعبہء اُردو سے ریٹائر ہوئے قریباً ربع صدی ہو چکی تھی لیکن وہ ادب کی دنیا سے کبھی غیر حاضر تصور نہیں کیے گئے تھے۔ وہ بنیادی طور پر بندۂ تحقیق تھے اور حقیقت کی جستجو میں ہمہ وقت قدیم کتابوں کی دنیا میں گم رہتے تھے۔ کسی غلط العام بات کی صداقت معلوم کر لیتے تو داخلی مسرت سے سرشار ہو جاتے اور اس کا ذکر اپنے کمرے میں داخل ہونے والے ہر شخص سے کرتے۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ اپنے کسی کارنامے پر فخر کا اظہار نہ کرتے بلکہ بڑی خاموشی اور بڑی آہستہ روی لیکن مستقل مزاجی سے اپنے تحقیق طلب موضوع کا مواد جمع کرتے رہتے اور جب مستند مواد ان کی دسترس میں آجاتا تو وہ پوری کتاب تالیف کر دیتے تھے جس کی تعریف اردو دنیا کے مشرق اور مغرب اور شمال وجنوب میں ہونے لگتی۔ میں یہاں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی کتاب ''مولانا ظفر علی خان'' پر ممتاز محقق مشفق خواجہ کی رائے پیش کرتا ہوں جو انہوں نے اپنے ایک ذاتی خط میں لکھی تھی۔ (یہ 25 جنوری 1995 کا مکتوب ہے)

''ادھر چند روز آپ کی کتاب ظفر علی خان کے ساتھ گزارے۔ بے حد خوشی ہوئی کہ اردو میں بہت دنوں بعد کوئی ڈھنگ کی کتاب نظر آئی، ظفر علی خان پر یہ ایک یادگار کام ہو گیا ہے۔ یہ کتاب لکھ کر آپ نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ ادبی سوانح کیسی ہونی چاہیے کاش، ہندوستان میں بھی اس کی اشاعت کی صورت نکل سکے۔ وہاں کے لوگوں کی دلچسپی کا بھی اس میں بہت سامان ہے''۔ (بحوالہ اورینٹل کالج میگزین شمارہ 301-302 صفحہ 110)

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے یہ کتاب اپنی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے دس سال بعد لکھی تھی اور یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب جسم کے اعصاب ضعف کا شکار ہو جاتے ہیں اور فرصت کے رات دنوں میں جی چاہتا ہے کہ

''بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے''

لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنے آپ کو ہمیشہ مصروف رکھا اور ریٹائرمنٹ کو نہ صرف متعدد نئے کاموں کا نقطہ آغاز قرار دیا بلکہ ملازمت کے دوران جو کام ادھورے رہ گئے تھے، ان کی تکمیل بھی کی۔ مثال کے طور پر جلیانوالہ باغ کے سانحے پر ایک کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا اور اس کی اطلاع مشفق خواجہ کو دی تو انہوں نے لکھا:

''آپ کی علمی مصروفیات کی تفصیل جان کر بے حد خوشی ہوئی، آپ ویسے تو زندگی بھر کام ہی کرتے رہے ہیں لیکن اس ''آزادی'' (یعنی ریٹائرمنٹ) کے زمانے میں وقت کو جس طرح آپ صرف کر رہے ہیں، اس کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔ ورنہ عام طور پر تو یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد علم و ادب سے بھی ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ خدا آپ کو صحت مند رکھے اور آپ اسی طرح مصروف رہیں۔''

مشفق خواجہ صاحب نے یہ دعا کسی نیک ساعت میں مانگی تھی اور یہ ان کی نیت کے خلوص کا نتیجہ بھی تھا کہ فوراً بازیاب ہوگئی۔ چنانچہ یہاں یہ لکھنا ضروری ہے کہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اگست 1984ء میں یونیورسٹی سے 60 برس کی مبینہ عمر پر پہنچنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوگئے تھے لیکن وہ 1978ء میں شعبہ اردو کے صدر مقرر ہوئے تو انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کی صد سالہ تاریخ مکمل کی، اس خدمت کے اعتراف میں ان کی ملازمت میں تین سال کی توسیع کر دی گئی۔ اس کو ان کی مصروف رہنے کی عادت کا کرشمہ سمجھے کہ اس دوران انہیں

برادر اسلامی ملک ترکیہ میں استنبول یونیورسٹی میں بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے عربی اور فارسی شعبوں کے ساتھ ایک نئے شعبے ''اردو'' کی بنیاد رکھی اور اپنی متعدد کتابوں کا مواد جمع کیا۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنی زندگی کا دھارا خود متعین کیا۔اس راہ کا ابتدائی سفر کانٹوں سے پُر تھا۔سماجی حالات ناسازگار تھے، خاندانی ماحول غیر علمی اور نامساعد تھا لیکن انہوں نے ہمت کی کمر باندھے رکھی اور مشکلات کی گردن توڑ کر آگے بڑھتے چلے گئے اور کامیابی کی منزلیں سرہوتی چلی گئیں، اب کیا مضائقہ ہے کہ ایک نظر ان کی زندگی پر ڈال لی جائے۔

سکول کے ریکارڈ کے مطابق ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی تاریخ ولادت 15 اگست 1924ء ہے۔13 برس کے بعد اس تاریخ سے ایک روز پہلے پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ چنانچہ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے پاکستان کے یوم استقلال (14 اگست) کو ہی اپنی سالگرہ کی تقریب سمجھا اور رسمی طور پر اپنی سالگرہ کبھی نہیں منائی۔ان کا آبائی وطن بٹالہ تھا جو خلاصۃ التواریخ کے مصنف منشی سبحان رائے کا قصبہ بھی تھا ضلع گورداسپور کا مردم خیز خطہ شمار ہوتا تھا۔انہیں محلے کے بچوں کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے کے لیے مسجد میں بھیجا گیا تو جابر مانیٹر (نگران سینئر طالب علم) کی چابک زنی برداشت نہ کرسکے۔اس ماحول سے باغی ہوگئے اور گھر آکر اعلان کردیا کہ میں مسجد میں پڑھنے کے لیے نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ انہیں مشن سکول میں داخل کرادیا گیا۔ان کی والدہ نے قرآن مجید کے صرف چند پارے پڑھے تھے۔گھر کے نامساعد مالی حالات کی وجہ سے ان کے والد انہیں استاد بنانا چاہتے تھے۔لیکن والدہ نے تعلیم کو ترجیح دی اور ان کی تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے گھر میں دستکاری کا کام کیا۔والدہ کی وفات کے بعد ان کی دستگیری بڑی بہن فاطمہ نے کی اور پورے خاندان کو والد کی عدم توجہ سے بچالیا۔

میٹرک کا امتحان مسلم ہائی سکول بٹالہ سے 1941ء میں دیا اور اچھے نمبروں سے فرسٹ ڈویژن حاصل کی ،اس دور میں ان کے اساتذہ نے ان کے دل میں شعروادب کا ذوق پیدا کردیا۔ وہ رسائل اور اخبارات میونسپل لائبریری میں پڑھتے۔غالب، اکبر، اقبال، ابوالکلام

آزاد، شبلی نعمانی، ظفر علی خان اور چوہدری فضل حق کی کتابیں گھر پر لے آئے اور بالاستعاب مطالعہ کرتے۔ ایف اے کی تعلیم کے لیے ایم اے او کالج امرتسر میں داخلہ لیا جس کے پرنسپل ڈاکٹر محمد دین تاثیر تھے۔ اور اساتذہ میں فیض احمد فیض، کرامت حسین جعفری، عبدالبصیر پال، عظیم الدین احمد اور محمد ادریس تھے۔ کالج کے ابتدائی چند مہینوں میں ہی مالی مشکلات آڑے آنے لگیں تو انہیں محکمہ ریلوے میں پارسل کلرک کی ملازمت تعلیم چھوڑ کر اختیار کرنی پڑی۔ یہ ملازمت ان کے مزاج کے مطابق نہیں تھی وہ مسلم قومیت اور تحریک پاکستان سے متاثر تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ نیشنل گارڈز سے بھی تعلق قائم کر لیا اور ملازمت کو تفریح کا وقفہ قرار دے کر سارا وقت تحریکی اور قومی کاموں پر صرف کرنے لگے۔ ریڈ کلف ایوارڈ انہوں نے لاہور میں سنا تو حیرت زدہ رہ گئے کہ ضلع گورداسپور جس میں بٹالہ بھی شامل تھا ہندوستان کو دے دیا گیا تھا۔ غلام حسین ذوالفقار اپنے خاندان کو بٹالہ سے نکال کر اور آگ اور خون کا دریا عبور کر کے 27 اگست 1947ء کو لاہور آ گئے۔

لاہور میں انہوں نے تعلیم کے سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے پہلے ادیب فاضل اور پھر انگریزی میں ایف اے اور بی اے کیا، ایم اے اردو میں داخلہ لیا تو ان کے سب سے اہم راہنما ڈاکٹر سید عبداللہ تھے جنہوں نے غلام حسین ذوالفقار کو یونیورسٹی سکالر کے عہدے پر فائز کیا اور ایم اے کے بعد نہ صرف ان کے تحقیقی، تنقیدی ذوق کو سنوارا بلکہ ''اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کے مقالے کی نگرانی بھی کی۔ اس مقالے کے بیرونی ممتحن ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان تھے۔ یہ مقالہ اپنی نظیر آپ ہے اور اعتراف اعرض یہ کہ میں نے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو ادب کی تحریکیں'' لکھتے وقت اس سے گراں قدر استفادہ کیا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار پنجاب اورینٹل کالج میں لیکچرار کے عہدے پر فائز ہوئے، ریٹائر ہوئے تو وہ صدر شعبہ بن چکے تھے اور ان کی 18 کتابیں چھپ چکی تھیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے ترکی میں اردو کا شعبہ کھولا۔ حج کی سعادت حاصل کی اور

مولانا روم کے مقبرے کی زیارت کی اور 15 مزید کتابیں لکھیں جن میں آپ بیتی، ''جگر لخت لخت'' بھی شامل ہے ان کی وفات جون 2007ء میں ہوئی۔ اس وقت وہ بزم اقبال لاہور کے ناظم تھے۔ حق مغفرت کرے۔
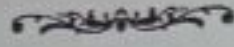
ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان

پروفیسر انوار احمد زئی نے عالم باعمل، استاذ الاساتذہ اور خلوص وتقویٰ کے پیکر ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان کے روز رحلت کو یاد کیا تو ایک سرد آہ بھر کر اس روز سے سوال کیا:

''اے 25 ستمبر 2005ء کے سورج، تجھے خبر بھی ہے تو کس نعمت غیر مترقبہ کو ہمارے درمیان سے اٹھا کر لے گیا ہے؟

اور پھر ان کے بہتے ہوئے آنسوؤں نے جواب دیا کہ یہ علمی، ادبی اور روحانی شخصیت ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان کی تھی جن کی سیرت کے خمیر میں ''خوشبو رنگ، روشنی، نور، علم، آگہی، حکمت، بصیرت، ہدایت، عجز، انکسار، مسکراہٹ زہد، تقویٰ، عبادت، ریاضت اور علم'' سب صفات عالیہ شامل تھیں۔ اور ان عناصر عالیہ کو انہوں نے اپنی زندگی میں لمحہء آخر تک بے دریغ تقسیم کیا اور پھر وہ علمی دانش گاہوں کے لیے استعارہ اور سالکان راہ حق کے لیے روحانی معرفت کا روشن ستارہ بن گئے، ان سے روحانی فیض حاصل کرنے والوں نے تو اپنے نام پردۂ اخفاء میں رکھنا مناسب سمجھا ہے لیکن جن چراغوں کو انہوں نے علم وادب کی روشنی عطا کی ان میں ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ابن انشاء، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر یحیٰ احمد ہاشمی، ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر نظیر حسین زیدی، ڈاکٹر احمر رفاعی، ڈاکٹر محمد مسعود احمد، ڈاکٹر الیاس عشقی، ڈاکٹر ابوسلیمان شاہجہان پوری، ڈاکٹر نظر کامرانی، ڈاکٹر وفا راشدی، ڈاکٹر معین الرحمٰن، ڈاکٹر حسن محمد، ڈاکٹر حسرت حسین گنجوی، پروفیسر انوار احمد زئی، اور قمر علی عباسی کے نام ڈاکٹر مسرور احمد زئی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں شمار کیے ہیں، ان کا یہ مقالہ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان کے حالات، علمی اور ادبی خدمات کا احاطہ کرتا ہے اور اپنی نظیر آپ ہے انہوں نے اس کام کا آغاز ڈاکٹر اسلم فرخی کی نگرانی میں جنوری 2001ء میں کیا تھا اور اس کی اجازت ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان

سے حاصل کر لی تھی اس مقالے کی تکمیل مارچ 2002ء میں ہو گئی تھی، لیکن ہمدرد یونیورسٹی کراچی سے ڈگری 21 مئی 2005ء میں تفویض کی گئی اور اشاعت اب عمل میں آئی ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان 23 ستمبر 1912ء کو جبل پور (سی پی۔ ہندوستان) میں پیدا ہوئے، وہ یوسف زئی خانوادے کے فرد فرید تھے، ان کے پردادا مولی خان نے 1827ء میں انگریز چیف کمشنر جے سٹیفنز کو بھری عدالت میں قتل کر دیا تھا۔ ان کے ننھیال کا تعلق پٹھانوں کے قبیلے ''کاکڑ'' سے تھا، والد مکرم حضرت گلاب خان (متوفی 1924ء) پولیس کے محکمے میں حوالدار تھے لیکن بعد میں مدرس بن گئے اور اپنے بیٹے غلام مصطفٰے خان کے دل میں تعلیم و تدریس کا شوق فراواں پیدا کر دیا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم جبل پور میں حاصل کی لیکن میٹرک اور پھر ایم اے تک کے امتحانات علی گڑھ یونیورسٹی سے پاس کیے، یہاں انہوں نے حافظ قاری ضیاء الدین الہ آبادی، احسن مارہروی، مولانا سلیمان اشرف، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ہادی حسن، مولانا ابوبکر اور حاجی حمید الدین سے فیض حاصل کیا اور سید سلیمان ندوی کے علم و فضل سے خط و کتابت کے ذریعہ استفادہ کیا۔ ان کی خوبی یہ تھی کہ اپنے محسنین کو ہمیشہ یاد رکھتے تھے، اس سلسلے میں ڈاکٹر مسرور احمد زئی نے مولانا عبدالغفور مہاجر مدنی، مولانا شاہ زوار حسین، علامہ پروفیسر محمد شفیع، نواب حبیب الرحمان خان شیروانی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان نے چھٹی صدی کے شاعر حسن غزنوی پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے یہ کام ناگ پور یونیورسٹی کے داخلی راہنما (Guide) کے بغیر خود اپنی تحقیقی مساعی سے کیا۔ انہوں نے استاد اردو کی حیثیت میں ملازمت کا آغاز کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی (برار) سے کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ ناگ پور یونیورسٹی میں آ گئے جہاں وہ صدر شعبہ اُردو مقرر ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کورٹ کے ممبر کے فرائض بھی تفویض کیے گئے۔

ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان جنوری 1948ء میں مستقل طور پر پاکستان آ گئے، اور پہلے اسلامیہ کالج میں اور پھر اردو کالج میں جسے مولوی عبدالحق نے قائم کیا تھا، صدر شعبہ اردو خدمات

انجام دیں اور کراچی یونیورسٹی میں بھی کلاسیں لیتے رہے، اس دوران ہی ان کی پہلی تصنیف ''فارسی پر اردو کا اثر'' شائع ہوئی۔ 1956ء میں وائس چانسلر آئی۔ آئی۔ قاضی نے انہیں سندھ یونیورسٹی میں۔ صدر شعبہء اردو کی مسند پیش کی تو وہ کراچی سے حیدر آباد منتقل ہو گئے اور پھر ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وفات تک یہیں قیام فرمایا۔ ایم اے کے سینکڑوں طلباء کی تحقیقی مقالات میں رہنمائی کی، پی ایچ ڈی کے قریباً چالیس طلباء نے ان کی نگرانی میں متنوع موضوعات پر گراں قدر تحقیقی مقالات لکھے اور اعلیٰ ملازمتوں پر فائز ہوئے۔ 1988ء میں یعنی ملازمت سے ریٹائر ہونے کے 12 برس بعد سندھ یونیورسٹی نے انہیں پروفیسر ایمرائٹس کے درجے پر فائز کیا۔ یہ مقام امتیاز انہیں سانحہء ارتحال تک حاصل رہا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کو پہلا ادبی ایوارڈ مجلس ترقی ادب لاہور نے 1961ء میں ''ثقافتی اردو'' لکھنے پر پیش کیا، نقوش ایوارڈ، اقبال ایوارڈ اور متعدد دیگر اعزازات کے علاوہ پاکستان گولڈن جوبلی قائداعظم ایوارڈ اور حکومت پاکستان کا ستارہ امتیاز ایوارڈ بھی عطا کیا گیا اور حقیقت یہ بھی ہے کہ ان عطائیگیوں سے ان ایوارڈوں کی توقیر میں اضافہ ہو گیا۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی تصنیفات کے موضوع متنوع ہیں اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کی معروف ادبی کتابوں میں ''علمی نقوش''۔ ''حالی کا ذہنی ارتقاء''۔ ''ادبی جائزے''۔ ''تحقیقی جائزے''۔ ''فارسی پر اردو کا اثر''۔ حسن غزنوی (حیات اور ادبی کارنامے)۔ ''تحریر و تقریر''۔ ''مجدد الف ثانی''۔ ''تحقیقی جائزہ''۔۔ ''معارف اقبال''۔ ''اقبال اور قرآن''۔۔۔ ''ہمارا علم و ادب''۔۔۔۔ ''میرا علی گڑھ''۔۔۔ ''ندائے سحر'' اور ''تاریخ اسلاف'' شامل ہیں۔ خالد محمود صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے نام لکھے گئے خطوط مرتب کر کے شائع کیے ہیں اور تلاش و جستجو کا کام ابھی جاری ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی ایک قلمی تصویر ان کے عقیدت مند اور شاگرد ڈاکٹر اسلم فرخی نے اس طرح پیش کی ہے:

''لمبا قد، لیکن بربنائے انکسار خم، دوہرا بدن کہ طلب علم و ریاضت میں خستگی سے محفوظ رہے۔ گول چہرہ دائرہ شریعت کا ترجمان، آنکھوں میں شرم وحیا اور معرفت کی قندیلیں روشن،۔۔۔رعونت کی سرکوبی کے لیے ترکی ٹوپی سے مزین سر پر خلق کے آثار، محاسن میں پاکیزگی کا حسن، گندمی رنگ میں طمانیت کی جھلک، معمولی سوتی شیروانی علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ، پاؤں میں سادہ سی گرگابی۔۔'' (بحوالہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان۔حالات علمی و ادبی خدمات'' از ڈاکٹر مسرور احمد زئی۔ص 155)

حافظ محمد موسیٰ بھٹو نے ان کے معمولات حیات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''آپ اپنا ذاتی کام خود کرتے ہیں۔۔۔ ہر کام میں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب خود تو تھوڑا سا کھانا کھاتے ہیں لیکن مہمان کو بہتر اور زیادہ کھلاتے ہیں۔ گھر میں کھانا اجتماعی طور پر کھاتے ہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ گھر میں کم از کم ایک وقت مل کر کھانا کھایا جائے تو اس سے گھر کا ماحول بھی اچھا رہے گا اور محبت بھی بڑھے گی۔''

ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''خود صبر کرنے سے بھی مخالف پر اچھا اثر پڑتا ہے اور دیکھنے والے پر بھی، یعنی صبر میں ایک حکمت ہے، اور صبر کرنے والے کے لیے اجر عظیم ہے۔''

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی باغ و بہار اور شگفتہ طبیعت کا تذکرہ ان کے متعدد معاصرین نے عقیدت و احترام سے کیا ہے۔ ان کی بذلہ سنجی کے چند واقعات:

''ایک بار ایک انتہائی صحت مند خاتون نے ڈاکٹر صاحب سے کہا

''حضرت، میں دروازے پر کھڑی ہوں، مجھے جن نے دھکا دے دیا''

ڈاکٹر صاحب نے فوراً کہا ''جن کو گزرنے کے لیے رستہ نہیں ملا ہوگا۔''

''ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے سامنے ایک صاحب ایک سیاسی لیڈر کی بہت تعریف کر رہے تھے، ڈاکٹر صاحب سنتے رہے لیکن جب انہوں نے اپنی پسندیدہ شخصیت کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کر دیئے تو ڈاکٹر صاحب نے برجستہ کہا ''ارے چھوڑیئے صاحب، وہ بھی پٹھان ہیں اور میں بھی پٹھان ہوں اور ہم پٹھانوں میں عقل وقل تو ہوتی نہیں''۔۔۔۔ وہ صاحب خاموش ہوگئے۔''

ایک واقعہ ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر اسلم فرخی کو یوں سنایا:

''میری طبیعت خراب تھی، ایک صاحب تشریف لائے، میٹرک پاس تھے، میں نے کہا'' یہ خط کسی خاتون کا ہے، میں بولتا ہوں آپ جواب لکھ دیں۔۔۔ میں نے لکھوایا'' میری طبیعت خراب ہے۔۔ دعا کیجئے۔۔۔ ان صاحب نے ''طبیعت'' کو ''ت'' سے (تبعیت) لکھا اور یوں لکھا کہ صرف ایک نقطہ پڑھا جاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد انہیں خاتون کا جواب آیا۔ لکھا کہ میں سمجھی نہیں آپ نے لکھا ہے۔۔۔ ''میری نیت بہت خراب ہے۔ دعا کیجئے۔''

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان اپنے بیٹے ڈاکٹر سراج احمد خان کا یہ واقعہ مزے لے لے کر سنایا:

''سراج میاں کراچی ایک شادی میں گئے ۔ایک خاتون نے انہیں دیکھ کر اپنے شوہر کو بلوایا اور ان سے تعارف کرایا۔ ان صاحب کا ایک ہاتھ کٹا ہوا تھا۔ خاتون نے کہا میرے شوہر ہیں، چند دن پہلے ہی پاکستان آئے ہیں،'' سراج میاں نے کہا'' سعودی عرب میں رہتے ہیں نا؟'' خاتون نے کہا'' جی، مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'' اس پر سراج میاں نے برجستہ کہا'' وہ ان کا ایک ہاتھ بھی کٹا ہوا ہے۔''

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کو بیت اللہ کی زیارت کا پہلا بلاوا 1953 میں آیا۔ پھر یہ سلسلہ 1974ء تک قائم رہا۔ انہوں نے گیارہ حج اور ایک عمرہ کیا تھا۔ 1971ء میں حج کے لیے بغداد

کے راستے گئے اور وہاں 25 گھنٹے قیام کے دوران مزارات نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کی زیارت بھی کی۔ان کے حج کے بعض اسفار کے اخراجات کی معلومات ایک غیر مطبوعہ بیاض میں درج ہیں، اس کے مطابق 1967ء میں اخراجات حج 1527 روپے اور 1973 میں 6380 روپے ہوئے۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کے خیال عالیہ میں ''تحقیق سے شغف محقق کی اضافی خوبی نہیں بلکہ یہ ایک طرز زندگی ہے۔ایک لائف سٹائل ہے۔ہمارے اعلیٰ پائے کے محققوں نے ہمارے اپنے زمانے میں اور محقق محدثین نے گزشتہ زمانوں میں زندگیاں اسی طرح سے گزاری ہیں۔''

خود اپنے بارے میں ان کا ارشاد تھا'' میں نے شعبہ تحقیق کا انتخاب اپنی فطرت کے عین مطابق کیا۔دراصل بچپن ہی میں تلاش، جستجو کا عمل میری زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ہر چیز کو سمجھنا، غور کرنا کہ یہ چیز کیوں ہے۔کیا ہے؟ فلاں شاعر یا شاعر کس حال میں تھا اور کیوں تھا؟ اور اس نے کیا کیا لکھا؟ یہ سوالات اکثر میرے ذہن میں ابھرتے تھے۔یہی میرا مزاج بن گیا''

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کا تعلق ایک دیندار گھرانے سے تھا، وہ ''ایک متقی، پرہیز گار، باشریعت اور صاحب مراتب بزرگ تھے، انہوں نے بے شمار لوگوں کو تزکیہ نفس اور تصوف کی تعلیم سے آراستہ کیا۔محمد راشد شیخ نے لکھا ہے کہ ان کے ہاں پیر اور جمعہ کو منعقد ہونے والی روحانی مجلس میں سب سے پہلے ہر شخص ایک پارۂ قرآن تلاوت کرتا۔اس کے بعد قرآنی دعائیں، صلوٰۃ تنجینا اور آخر میں مراقبہ ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے کہ انہیں جو کچھ بھی ملا ہے تلاوت قرآن کی برکت سے ملا ہے۔وہ قرآن مجید کی تعلیمات پر خود بھی عمل کرتے اور دوسروں کو بھی اس کی نصیحت کرتے۔''

25 ستمبر 2005ء کو ان کی وفات کے ساتھ علم و ادب اور مدرسہ شریعت کا ایک باب بند ہو گیا۔اس وقت ان کی عمر 93 برس تھی۔
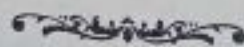
ڈاکٹر فہیم اعظمی

ڈاکٹر فہیم اعظمی اچانک وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی لوٹ کر اس دنیا میں نہیں آتا، ٹیلی ویژن پر عراق کی خبریں اور امریکی فوجیوں کے مظالم کی تصویریں دکھائی جارہی تھیں اچانک اک پٹی چند لمحوں کے لیے سفید اسکرین کے زیریں حصے پر نمودار ہوئی۔

''اردو کے ممتاز دانشور ادیب ڈاکٹر فہیم اعظمی کراچی میں انتقال کر گئے۔''

میرا دل ایک دم دھڑ کا اور دل سے دعا نکلی

''خدا کرے خبر غلط ہو''

لیکن خبر بار بار چلنے لگی تو میں نے ڈاکٹر وزیر آغا کو فون کیا، انہوں نے یہ خبر چند لمحے پہلے پڑھی تھی وہ بھی دم بخود تھے۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی کی وفات کا یقین انہیں بھی نہیں آیا۔ چند روز قبل ان کی آواز ٹیلی فون پر سنی تھی وہ اردو افسانہ 2002ء کے بارے میں لکھے جانے والے جائزے کی تیسری قسط کا تقاضا کر رہے تھے لیکن ان کی آواز میں ان کی روایتی کھنکھاہٹ موجود تھی، وہ مجھے میرے عارضہ قلب پر دلاسہ دے رہے تھے۔

ماہنامہ صریر میں لکھنے والے کراچی کے سب ادیب رو رہے تھے، وہ فرد فرید جس نے پندرہ برس قبل صریر کی شمع روشن کی تھی اور اردو ادب کے نئے تصورات کی تازہ آکسیجن فراہم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا آج اس بھری محفل کو سوگوار کر گیا۔ اس وقت فہیم اعظمی کی عمر اسی برس تھی لیکن وہ ساٹھ سال سے بھی کم کے مرد دانشمند نظر آتے تھے اور جدید ادب کے موضوع پر باتیں کرتے تو محسوس ہوتا کہ سقراط اپنی اکادمی میں ہم سے مخاطب ہے اور اپنی کتاب دانش کے اوراق کھول رہا ہے۔

پروفیسر عتیق احمد نے بہت عرصے پہلے ان کی عملی زندگی کا سچ کچھ اس طرح لکھ دیا تھا:

''یہ حقیقت ہے کہ فہیم اعظمی کے متعلق یہ بات قطعیت سے کہنا ممکن نہیں کہ وہ پڑھتے زیادہ ہیں یا لکھتے ہیں۔ صریر کے ہر ماہانہ شمارے میں اپنے لکھے ہوئے اداریے سے لے کر قارئین کے خطوط میں اٹھائے گئے علمی و ادبی سوالات کے جوابات تک اور جدیدیت کے کسی نہ کسی پہلو پر تفصیلی نوٹ اور رائدین جدیدیت کے زیر عنوان مفصل مضمون اور موصولہ کتب پر تبصرے تک ایک غیر روایتی ایڈیٹر' ادبی مسائل اور مبصر و مفسر کا کردار نبھانے میں وہ سال کے 365 دن گزارتے ہیں۔''

ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کی تخلیقی حسیات کا شمار کیا تو اعتراف کیا کہ:

''ڈاکٹر فہیم اعظمی تخلیق کار بھی ہیں، نقاد بھی مفکر بھی ہیں اور ایک بہت اچھے مدیر بھی مگر ان جملہ حیثیتوں کے ملاپ سے ان کی وہ حیثیت بھی ابھری ہے جو انہیں جدید اردو ادب میں خرد افروزی کی تحریک کے ایک اہم اور سرگرم کارکن کے طور پر پیش کرتی ہے۔ جذباتیت، رجعت پسندی اور تنگ نظری کے کلاوے میں جکڑا ہوا یہ زمانہ جس میں بعض اذہان علم پر پہرے بٹھانے کا سوچ رہے ہیں اور جس کے سینے سے چمٹی ہوئی نئی پود نے مطالعہ اور سوچ بچار کے عمل کو تج کر تصویر اور تصور میں خود کو گم کر دیا ہے۔۔۔ (اس زمانے میں فہیم اعظمی کے) خیال انگیز مضامین قاری کو نئے فکری منطقوں میں کولمبس اور مارکو پولو کی طرح آگے بڑھنے پر اکساتے ہیں اور اپنے زمانے میں سجاد انصاری اور نیاز فتح پوری نے جو کام کیا تھا، وہی آج کے زمانے میں ڈاکٹر فہیم اعظمی انجام دے رہے ہیں۔''

فہیم اعظمی کی تخلیقی زندگی کا آغاز ایک ناول نگار کے طور پر 1960ء میں ہوا تھا۔ اس وقت ان کی عمر صرف 36 سال (پیدائش 1924) تھی۔ لیکن وہ زندگی کے جلوے اتنے تجربات

سمیٹ چکے تھے کہ انہیں افسانوں کو قاش قاش صورت دینے کے بجائے پورے ناول کی صورت دے دی ان کا یہ ناول ''بہت دیر ہو چکی'' کے عنوان سے چھپا تھا۔لیکن روایتی ناولوں کی افراط میں ''قبول عام'' حال نہ کر سکا۔ بہت عرصہ بعد فہیم اعظمی کی شاعری کی پہلی اور آخری کتاب ''شوق منفعل'' شائع ہوئی تو میں نے تبصرے میں لکھا:

''ڈاکٹر فہیم اعظمی بنیادی طور پر شاعر ہیں اور انہیں یہ فن اپنے والد گرامی جناب عقیل اعظم گڑھی سے ورثے میں ملا تھا۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی ان کے بھائی تھے اور شوق منفعل سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے شاعری کے ساتھ خاصا لمبا عرصہ محبت گزارا ہے لیکن پھر فلسفیانہ اور فکری کتب کے مطالعہ کا شوق انہیں نثر کے خیابانوں میں لے گیا اور وہ افسانہ ناول اور تنقید لکھنے لگے۔ چنانچہ فہیم اعظمی کی شاعری پس منظر میں چلی گئی پھر ماہنامہ صریر جاری کر کے ادبی صحافت کی طرف آئے تو اس میں صرف اپنی غزلیں نظمیں چھاپنے کے بجائے دوسروں کی غزلیں ''نظمیں اور شاعری کی دیگر اصناف سخن چھاپنے لگے۔''

یہاں اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ اردو ادب کی جو خدمت ،فکری اور انفرادیت کے زاویوں سے شیخ عبدالقادر کے رسالہ مخزن یا دیار ائن قلم کے رسالہ ''زمانہ'' مولانا صلاح الدین احمد کے رسالے ادبی دنیا، میاں بشیر احمد اور مولانا حامد علی خان کے رسالہ ''ہمایوں'' شاہد احمد دہلوی کے رسالہ ''ساقی'' نیاز فتح پوری کے رسالہ نگار اور آزادی کے بعد ادب لطیف، نقوش، سویرا، سیپ ، نیا دور، اوراق اور فنون وغیرہ نے کی ویسی ہی خدمت گزشتہ پندرہ برس سے فہیم اعظمی کا رسالہ صریر بھی انجام دے رہا تھا۔صریر ہر ماہ 88 صفحات پر محیط بروقت شائع ہوتا تھا اور ہر سالگرہ پر چار پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم اشاعت پیش کرتا۔صریر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس کا مدیر ایک مثبت فکر ونظر رکھنے والا دانشور ادیب تھا جس کے فکر انگیز اداریوں کو آراء کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی پیش کیا گیا۔ وزیر آغا کے رسالہ اوراق کے اداریوں کی کتاب کی

اشاعت کے بعد یہ ادبی صحافت کی اہم ترین کاوش ہے اور اب یہ کتابیں جدیدیت کے حوالوں سے معتبر ترین کتابیں شمار ہوتی ہیں۔

ماہنامہ صریر کا ایک اور فکر انگیز سلسلہ رائدین جدیدیت تھا "جدید" سے مراد کوئی خاص تھیوری یا تحریک نہیں بلکہ وہ ذہنی اور فکری رویہ ہے۔ جس نے ہمیں آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا۔ ڈاکٹر فہیم اعظمی نے یہ حقیقت بازیافت کرنے کی کوشش کی کہ جدید ماڈرنزم کا نظریہ، رجحان یا تحریک کب شروع ہوئی تو وہ بیسویں صدی سے الٹا سفر کرتے ہوئے انیسویں صدی میں چلے گئے اور انہوں نے بے حد طمانیت محسوس کی کہ "انیسویں صدی میں بھی، تنقید، تنقیص، انحراف، مخالفت اور بغاوت وغیرہ سب کچھ موجود تھا۔" اس کتاب میں الجیریا (سلطنت روم) کے رائد سینٹ آگسٹین سے لے کر 1934ء تک کے امریکی رائد جون اپڈائیک کے رائدین بھی موجود ہیں جن کا سلسلہ نظیرا کبر آبادی، اسد اللہ خان غالب، سر سید احمد خان، علامہ اقبال منشی پریم چند، میراجی، ڈاکٹر وزیر آغا، گوپی چندر نارنگ، محمد حسن عسکری اور شمس الرحمٰن تک پہنچتا ہے تو رائد (پایونیر) کی اصطلاح کے حقیقی معنی آشکار ہو جاتے ہیں۔

فہیم اعظمی کے ناول "ڈسٹی نیشن مین ہول" میں زندگی کی حقیقتیں اور تصوراتی خیالیے ایک اخبار کے اداریئے کے ان جملوں سے تلاش کیے گئے ہیں:

"سڑکوں اور گلیوں میں کھلے مین ہول بھی آہستہ آہستہ ہماری زندگی کا لازمی حصہ بنتے جا رہے ہیں۔"

ممتاز ترقی پسند نقاد محمد علی صدیقی نے اس ناول کا پیش لفظ لکھا تو فہیم اعظمی کو مبارکباد دی کہ وہ ایک مشکل مشن سے بہ حُسن وخوبی عہدہ برا ہوئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول کے کردار خوردبینی سطح سے اوپر اٹھ کر دوربینی تناظر میں بدل رہے ہیں اور قصہ گوئی کی زمینیت کے باوجود اس ناول میں انسانی زندگی کے استعارہ کی کیفیت ہے۔ "غلط انداز دنیا کی نفی کرنا اور صحیح انداز کائنات کی دریافت فہیم اعظمی کی ادبی زندگی کا مشن تھا جس کے متعدد زاویئے ان کے ناول

"جنم کنڈلی" اور افسانے" کی کتاب "حصار" اور "پھر کیا ہوا" میں موجود ہیں۔ آپ کے لیے یہ انکشاف بھی حیرت انگیز ہوگا کہ "جنم کنڈلی" جیسے جدید ترین ناول کا سب سے اچھا تجزیہ ترقی پسند نقاد سہیل ادیب نے کیا اور فہیم اعظمی کی ارضیت دریافت کی۔ فہیم اعظمی بلاشبہ ایک دانشور اور مفکر ادیب تھے لیکن وہ ایک زمینی انسان بھی تھے اور جو کچھ سطح عالم پر ہو رہا تھا وہ اس کا مطالعہ غائر نظروں سے کرتے تھے۔ سیاسیات پر ان کی کتاب "پاکستان کے بورژوا انقلابات" اور "پاکستان میں قوم اور قومیتوں کا مسئلہ" میں انہوں نے قائداعظم اور علامہ اقبال کے تصورات کے تحت قائم ہونے والے پاکستان کو بکھرتا ہوا اور بگڑتا ہوا دیکھا اور اپنے ملال سے تعمیر کی صورت پیدا کی وقت کی رفتار اور لمحے کی چاپ کو انہوں نے ایک زیرک اور ہوشمند انسان کی حیثیت میں سنا اور اپنا تاثر شاعری میں تخلیقی سطح پر محفوظ کر دیا۔ اپنی شاعری میں انہوں نے مثبت قومی زاویوں کو ابھارا اور اس شاعری کا فریضہ ادا کیا جس کی آنکھ قوم کے درد پر خوں بار ہو جاتی ہے۔ فہیم اعظمی اپنی ان تمام عظمتوں سے واقف اور شناسا تو ضرور ہوں گے لیکن انہوں نے کبھی اس کا اظہار اپنے قلم اور زبان سے نہیں کیا انہوں نے صریر میں اپنی کسی کتاب پر توصیفی یا ستائشی تبصرہ شائع نہیں کیا۔ وہ صریر کے ہر صفحے پر موجود رہتے تھے لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ اپنے موجود ہونے کا احساس نہیں دلاتے تھے اور ہمیشہ دوسرے ادیبوں کو منظر پر ابھارنے اور نئے لکھنے والوں کو متعارف کرانے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔

فہیم اعظمی کراچی میں مقیم تھے اور میرا مسکن لاہور میں تھا۔ ان سے میری ذاتی ملاقاتیں بہت کم تھیں لیکن وہ مجھے ہمیشہ اپنی رگِ جاں سے قریب رکھتے تھے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ روزنامہ جنگ میں چھپنے والے سالانہ ادبی جائزوں کو انہوں نے باقاعدگی سے اپنے رسالہ صریر میں پیش کیا اور جب یہ سلسلہ جنگ میں بند ہوا تو صریر کے صفحات طویل سالانہ ادبی جائزے کے لیے کشادہ کر دیئے۔ چنانچہ 1996ء اور 1997ء کے طویل ترین ادبی جائزے صریر میں چھپے اور بعد میں کتابی صورت میں پیش کیے گئے تو فہیم اعظمی نے اول الذکر کتاب کا پیش لفظ لکھا اور

''مزید ادبی جائزے'' پر پروفیسر افتخار اجمل شاہین کا خیال افروز تبصرہ شائع کیا۔ دوسری طرف خود اپنی کتاب پر تبصرے کا کہیں تقاضا تک نہیں کیا۔ بلاشبہ وہ از سرتا پا ایک سچے ادیب، شہرت سے بے نیاز انسان اور ایک بے حد مخلص دوست تھے۔ میرا ذاتی دکھ یہ ہے کہ عارضہ قلب میں مجھے زندگی کی دعائیں دیتے دیتے وہ خود اپنا رخت سفر حیات سمیٹ گئے اور مجھے اپنے التفات فراواں سے جو کم و بیش ربع صدی پر پھیلا ہوا ہے محروم کر گئے..... افسوس!
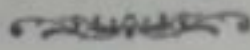
فیض احمد فیض

فیض کی پہلی نظم ''گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالہ ''راوی'' میں'' میرے معصوم قاتل'' کے عنوان سے 1929ء میں شائع ہوئی تو ان کی عمر 18 سال تھی۔30 سال کی عمر میں ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''نقش فریادی'' 1941ء میں شائع ہوا لیکن اس وقت تک ان کی شہرت کو پر لگ چکے تھے اور وہ نہ صرف نئی غزل کے نمایاں شاعر تسلیم کیے جا چکے تھے بلکہ ان کی غزل کے نئے آہنگ اور تازہ کاری نے بھی نوجوانوں کو مسحور کر رکھا تھا۔میں نے ان کا نام پہلی دفعہ 1944ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں سنا جہاں میں سال اول کا طالب علم تھا۔جناب رفیق خاور فارسی کے استاد تھے لیکن شاعری اردو میں کرتے تھے۔ان کی دو نظمیں...... ''حسن کی دیوی ریحانہ'' اور ''زہرہ نے میرا سکھ چھینا''..... جو اختر شیرانی کے اسلوب شعر میں لکھی گئی تھیں۔طالب علموں میں بہت مشہور تھیں۔ایک دن خالی پیریڈ میں طلباء رفیق خاور صاحب کے گرد جمع ہو گئے اور ان سے یہ نظمیں سنانے کی درخواست کرنے لگے تو انہوں نے یہ قطعہ اپنے مخصوص تحت اللفظ میں سنایا۔

رات یوں کھوئے ہوئے دل میں تری یاد آئی
جیسے ویرانوں میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

پروفیسر رفیق خاور صاحب جب اپنے طلباء کی داد سمیٹ چکے تو انہوں نے فرمایا'' یہ قطعہ میرا نہیں بلکہ فیض احمد فیض کا ہے اور آپ کو اس لیے سنایا ہے کہ ان کی شاعری کی کتاب خرید کر یا لائبریری سے لے کر پڑھیں۔''اب مجھے یاد آتا ہے کہ رفیق خاور صاحب نے کتاب کا نام طلباء کا اشتیاق بڑھانے کے لیے نہیں بتایا تھا اور جب طلباء کے شور کو انگیخت مل گئی تو انہوں نے

کہا، کتاب کا نام ہے ''نقشِ فریادی'' اور یہ کالج کے سامنے ''قومی کتب خانے'' سے مل سکتی ہے۔ ''اس کتاب کی قیمت زیادہ نہیں تھی۔ لیکن میرا جیب خرچ خریداری کا متحمل نہیں تھا۔ اس لیے میں نے دلی دروازے کے باغ میں واقع'' شاہ محمد غوث لائبریری'' سے لے کر پڑھی۔ فیض احمد فیض سے یہ میرا پہلا تعارف تھا اور وہ میری طالب علمانہ دانش سے بلند تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ لاہور سے دور میں نے محکمہ آبپاشی میں ملازمت اختیار کی تو محکمہ نہر کے ویران بنگلوں کی تنہائی میں کتابیں ہی میری دوست تھیں، میرا محبوب موضوع تو افسانہ تھا لیکن میں نے شاعری کی کتابوں کو بھی اپنے مطالعے کا حصہ بنا رکھا تھا اور ان میں فیض صاحب بھی شامل تھے۔ اب اپنی زندگی کے 81ویں سال میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اقبالؒ کے بعد فیض احمد فیض بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کیے جا چکے ہیں، بلاشبہ آزاد نظم کو فروغ دینے والوں میں تصدق حسین خالد، عطاء اللہ سجاد، میرا جی، اور ن۔ م۔ راشد کی اہمیت زیادہ ہے لیکن قبولِ عوام فیض کو ملا اور اس صدی کے جائزوں میں اقبالؒ کے بعد فیض کو ہی ان سب پر فوقیت دی گئی ہے اور اب میں اپنے آپ کو ان خوش قسمت لوگوں میں شمار کر سکتا ہوں جنہوں نے اپنی زندگی اور ادب کا سفر فیض صاحب کی شہرت کی چاندنی میں طے کیا۔ ان کے مطالعے سے دل و دماغ کو منور کیا اور ان کی محفل غائبانہ سے استفادہ کیا۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔ میں نے ان کی سب کتابیں بالاستعاب پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

فیض صاحب 13 فروری 1914ء کو سیالکوٹ کے ایک دور افتادہ گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بیرسٹر سلطان محمد خان اپنے علم اور قسمت کی اساس پر افغانستان کے امیر عبدالرحمان کے دربار میں میر منشی (چیف سیکرٹری) مقرر ہو گئے۔ دربار میں ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں تو جان بچا کر انگلستان چلے گئے۔ اس دوران امیر افغانستان کا رویہ تبدیل ہو گیا تو انہیں برطانیہ میں افغانستان کا سفیر مقرر کر دیا۔ واپس سیالکوٹ آئے تو شاہانہ زندگی بسر کی۔ فیض صاحب نے لکھا ہے:

"..... میں ابھی کالج میں تھا تو ان (والد صاحب) کا انتقال ہو گیا۔ جنازے وغیرہ سے فارغ ہوئے تو قرض خواہ آنے لگے..... اب معلوم ہوا کہ ہم لوگ اس زمانے میں 80 (اسی) ہزار روپے کے مقروض تھے۔ انہوں نے (والد صاحب) نے ہمیں کبھی نہیں بتایا کہ تمام فراخدلی قرض کی بدولت تھی۔ ("ادبیات" فیض نمبر... ص292)

فیض صاحب کے بڑے بھائی خلیل احمد خان مقدمے بازی میں الجھ گئے۔ فیض صاحب نے شاعری سے لو لگائی اور تمام عمر دل و نظر کا حق ادا کرتے رہے۔ زندگی قناعت اور سیر چشمی سے گزاری۔ اپنے پورے عہد کو متاثر کیا اور ایک فقیرانہ صدا لگانے لگے

دوستو، ختم ہوئی دیدۂ تر کی شبنم ۔۔۔ اب کوئی اور کرے پرورش گلشن غم
دیکھیے، دیتے ہیں کس کس کو صدا میرے بعد ۔۔۔ کوئے جاناں میں کھلا، میرے لہو کا پرچم
خاک راہ، آج لیے ہے، لب دیدار کا رنگ ۔۔۔ تھم گیا شور جنوں، ختم ہوئی بارش سنگ

ترقی پسند تحریک کے ایک نامور شاعر کی حیثیت میں انقلاب کی آواز فیض نے بھی اٹھائی اور غریب عوام سے مضبوط ناطہ بھی جوڑا لیکن ترقی پسند تحریک کو اپنی شرائط پر قبول کیا تو تسلیم و رضا کی خو کو قائم رکھا۔ چنانچہ کمیونسٹ پارٹی نے "اقبال کے انہدام" کی "پارٹی لائن" جاری کی تو فیض صاحب نے اس کی مخالفت کی۔ پھر انجمن ترقی پسند مصنفین نے انقلاب کے سرخ پرچم کو سوویت یونین سے ابھرتے دیکھا تو اس تحریک کے ادبی رسائل پر غیر ترقی پسندوں کی اشاعت ممنوع قرار دے دی۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں اسے 'ادبی مارشل لاء" قرار دیا اور جن ادیبوں کو گردن زدنی قرار دیا گیا تھا ان میں سعادت حسن منٹو، یوسف ظفر، نسیم حجازی، شورش کاشمیری، صمد شاہین، ممتاز شیریں، محمد حسن عسکری، قیوم نظر اور شیر محمد اختر جیسے ادباء شامل تھے۔ اس قرارداد کو سب ترقی پسند ادیبوں نے قبول کیا۔ صرف فیض احمد فیض نے اس کی مخالفت کی۔ چنانچہ ترقی پسند رسالہ "سویرا' شائع ہوا تو اس میں غیر ترقی پسند ادیبوں کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ محب وطن قاری نے سویرا نمبر 6 پڑھنے سے انکار کر دیا اور کئی برسوں کے بعد کباڑیوں نے

اس پرچے کو فٹ پاتھ پر فروخت کیا۔ یہ دو واقعے فیض کی کشادہ دلی اور بلند نظری کے مظہر ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے بیشتر شاعروں مثلاً مخدوم محی الدین علی سردار جعفری، عارف عبدالمتین، احمد ندیم قاسمی وغیرہ نے مروجہ زبان اور مقبول عام اسلوب میں تحریکی شاعری لکھی لیکن فیض احمد فیض نے اپنے فن کا چاک منفرد انداز میں گھمایا اور صریر خامہ کو نوائے سروش بنانے کے لیے اپنا شعری ڈکشن الگ تراشا۔ ڈاکٹر گوپی چندر نارنگ نے انہیں خراج تحسین ادا کیا تو لکھا:

"فیض کے فن میں سخن سنجی اور نرم آہنگ نغمہ خوانی کو زیادہ اہمیت حاصل ہے ......ان کا لہجہ غنائی ہے، انکا دل محبت سے چور ہے۔ ان کا شعری وجود ایک روشن الاؤ کی طرح ہے جس میں دھیمی دھیمی آگ جل رہی ہے اس کے سوزوں میں سب ہنگامی آلائشیں پگھل جاتی ہیں اور جمالیاتی حسن کاری کی آنچ سے تپ کر تخلیقی جوہر تابندہ و روشن ہو اٹھتا ہے۔"

بیشتر ترقی پسند شعراء کی شاعری سوویت یونین کے انہدام کے بعد طاق نسیاں کی نذر ہو چکی ہے لیکن میر تقی میر اور مرزا غالب کی طرح فیض کی شاعری وقت کے پل صراط کو عبور کر چکی ہے اور اس کے اثر و عمل کا اندازہ اس حقیقت سے لگایئے کہ آج دین و مذہب اور سیاست و تہذیب کے ایوانوں میں مطالب و معانی عوام تک پہنچانے کے لیے فیض کے اشعار سب سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں۔

فیض صاحب اپنی زندگی میں شہرت کے آسمان پر پہنچ چکے تھے۔ شاید انہیں اس حقیقت کا علم بھی تھا لیکن ایک اور حقیقت یہ بھی ہے کہ وہ سستی شہرت کو پسند نہیں کرتے تھے اور دوسرے شاعروں کو ان کا حق دینے اور ان کی عظمت تسلیم کرنے سے ہرگز گریز نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ شہزاد احمد نے بتایا کہ لندن کی ایک محفل میں جس میں زہرا نگاہ، اور احمد فراز بھی موجود تھے۔ کسی نے فیض صاحب سے کہا "آپ بیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر ہیں"..... فیض صاحب سن کر خاموش ہو گئے۔ پھر سگریٹ کا لمبا کش لیا اور اپنے دھیمے شیریں لہجے میں

بولے :..... بھائی انیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر غالب تھا۔ بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر اقبال ہے''۔ محمد خالد اختر کا ناول ''چاکی واڑہ میں وصال'' جو نظروں سے اوجھل ہو کر فراموش کر دیا گیا تھا فیض صاحب نے پڑھا تو اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ جس کسی کو ملتے یہ ناول پڑھنے کا مشورہ دیتے اور کہتے'' ہمارے درمیان محمد خالد اختر جیسا بڑا ناول نگار موجود ہے۔'' کشور ناہید نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ لوگوں نے بہت کوشش کی فیض صاحب اور راشد صاحب کو لڑوانے کی، راشد صاحب برہم بھی ہوئے اور اس بات سے چڑ بھی جاتے تھے کہ لوگ ان کے مقابلے میں فیض صاحب کو بڑا شاعر کیوں کہتے ہیں مگر فیض صاحب سے جب بھی ذکر ہوا وہ ہمیشہ راشد صاحب کی تعریف بھی کرتے تھے اور عزت بھی۔ اس طرح ایک دو دفعہ ہمارے ساتھ چل کر قاسمی صاحب کے پاس بھی گئے۔''

فیض صاحب آج ہم میں موجود نہیں لیکن ان کا نام خواص کی زبان پر اور ان کا کلام عوام کے دلوں میں محفوظ ہے۔ بلاشبہ وہ دوام ابد پا چکے ہیں اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے سب سے بڑے شاعر ہیں جنھیں یاد کرنے والے ہر زمانے میں موجود رہیں گے۔

گفتار خیالی

1980ء کی دہائی میں میرا تبادلہ سرگودھا سے کوٹ ادو کے مقام پر ہوا تو اس دور افتادہ قصبہ نما شہر کی دو مستقل نسبتیں میرے ذہن میں قائم تھیں اول یہ کہ آزادی کے بعد تعمیر ہونے والا آبپاشی کا پہلا بڑا منصوبہ جو تکمیل کو پہنچا اور تونسہ بیراج کے نام سے مشہور ہوا، وہ کوٹ ادو کے قریب واقع تھا، دوم اس شہر سے تھوڑے فاصلے پر لیہ واقع تھا جو اب اس خطے کے مشہور شاعر جناب نسیم کے نام کا حصہ بن چکا تھا اور وہ نسیم لیہ موسوم تھے۔ اس شہر میں ہی امروہہ سے نقل مکانی کر کے تشریف لانے والے شاعر جناب خیال امروہوی نے اپنے شاگردوں کا ''سلسلہ خیالیہ'' جاری کر رکھا تھا جس کے ایک سرخیل جناب گفتار خیالی بھی تھے۔ کوٹ ادو پہنچ کر میں نے ابھی اپنا سامان محکمہ نہر کی کالونی میں الاٹ شدہ ایگزیکٹو انجینئر کے بنگلے میں نہیں کھولا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دیکھا کہ ایک نوجوان ناشتے کا سامان ایک خوبصورت طشت میں سجائے کھڑا ہے۔ میں نے اس اجنبی کو غور سے دیکھا تو وہ بولا ''میرا نام گفتار خیالی'' ہے، اور میں آپ کو ادبی رسائل اوراق، تخلیق، سیپ، افکار اور ''اردو زبان'' میں پڑھتا رہتا ہوں۔'' توقف کے ایک لمحے میں میرے ذہن میں جس گفتار خیالی کا سراپا ابھرا وہ ایک عمر رسیدہ شاعر تھا جس سے میری کئی ملاقاتیں غائبانہ طور پر رسائل میں ہو چکی تھیں، اب میں شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گیا کہ جو نوجوان میرے سامنے کھڑا تھا وہ گفتار خیالی کیسے ہو سکتا ہے۔ میں انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔

پہلی ملاقات میں انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ خیال امروہوی صاحب کے شاگرد ہیں اور خیال امروہوی رہتے تو لیہ میں ہیں لیکن ملازمت گورنمنٹ کالج علی پور میں کرتے ہیں اور اپنے بارے میں کہا کہ شاعری ان کا شوق ہے، پیشہ نہیں اور وہ ایک مقامی سکول میں پڑھاتے

ہیں۔اس پہلی ملاقات میں ہی گفتار خیالی نے مجھے اپنی متعدد غزلیں سنائیں اور مجھے اطمینان ہو گیا کہ ان کی شاعری کا تجربہ ان کی عمر سے آگے ہے۔ اور وہ لاہور جیسے ادبی مرکز سے دور بیٹھ کر ادب کی خدمت کر رہے ہیں تو اس میں خلوص زیادہ ہے۔ اور ان کا ادب کا شوق نمائشی نہیں بلکہ ان کے داخل کے اظہار کا وسیلہ اور ان کی روح کی تسکین کا باعث ہے۔اب حقیقت کھلی کہ جس گفتار خیالی کو میں عمر رسیدہ اور تجربہ چشیدہ شاعر سمجھ رہا تھا وہ یہی نوجوان تھا جس کے سر پر ایک دانشور بوڑھے کا سر رکھا تھا۔ اور وہ دنیا کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ان کی غزلیں سن کر خوب داد دی۔ یہ نئے لہجے کی غزلیں تھیں۔

کوٹ ادو میں مجھے تین سال کے قیام کا موقع ملا۔ گفتار خیالی کا دولت خانہ دائرہ دین پناہ میں تھا جو ''ڈھولے والہ بند'' پر جانے والی سڑک کے راستے میں بہاولپور سے پہلے آتا تھا۔ ملتان اور مظفر گڑھ سے لیہ جانے والی لاریاں یہاں رکتیں، مسافر چائے پیتے، سوکھے رس کھاتے اور اگلی منزل کو روانہ ہو جاتے، میں یہاں گفتار خیالی کی شاعری سننے کے لیے رک جاتا۔ چائے کے ایک ''کھوکھے'' پر ان سے لمبی نشست ہوتی۔ انہیں دنوں گفتار خیالی نے بتایا کہ ''کاروان ادب'' ملتان کے محمد عمر خان ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''مدار شعور'' کے نام سے چھاپ رہے ہیں۔ جس کا پیش گفتار جناب رئیس امروہوی نے لکھا ہے۔ ملک کے اس قادر الکلام شاعر نے بڑی کشادہ دلی سے مضافات کے ایک شاعر کو خراج تحسین پیش کیا تو لکھا:

''گفتار خیالی کی غزل تغزل کی جدید نشاۃ ثانیہ کا دلنواز نمونہ ہے۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی برجستگی اور روانی ہے۔ شاعر کو لفظوں پر مکمل گرفت حاصل ہے۔ اور کوئی مضمون یا تخیل اور احساس کا کوئی نکتہ ایسا نہیں جس کا واضح ابلاغ اس کے امکان سے باہر ہو۔ انہوں نے غزل کو غزل کی طرح برتا ہے اور اپنی روح کی تمام شعوری اور غیر شعوری کیفیتوں کو اشعار میں طرح طرح منعکس کیا ہے۔'' رئیس امروہوی نے اس پیش لفظ میں گفتار خیالی کے تین اشعار بطور مثال اقتباس کیے ہیں:

بادلوں کا کیا بھروسہ، دھوپ کا کیا اعتبار
آدمی کو چاہیے، دریا کا دھارا دیکھنا

○

رات میں نے خواب میں دیکھے ہیں گل جلتے ہوئے
خواب صادق ہے تو پھر تعبیر کا اعلان کر

○

دیکھا گیا نہ جس کا دریچہ کھلا ہوا
آباد میرے گاؤں میں ایسا مکاں بھی ہے

رئیس امروہوی نے ارشاد فرمایا ''گفتار خیالی غزل کے لیے تخلیق ہوئے ہیں اور غزل کی تخلیق ان کی سرشت شاعرانہ کا اقتضا اور طبعی فریضہ ہے۔ میں نے گفتار خیالی کی شاعری کا مطالعہ کیا تو مجھے ان کے ہاں ایک عجیب نوع کا جمال اور جلال امتزاج پذیر ہوتا نظر آیا۔ تب انہوں نے جناب خیال امروہوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور انہوں نے گفتار خیالی کو جلال کے زاویوں سے آشنا کیا۔ چنانچہ وہ بادِ نو بہار میں ٹہلتے ٹہلتے اور گلوں میں رنگ بھرتے بھرتے کازار حیات میں شمشیر برہنہ لے کر کود پڑے اور غزل کے ساتھ نظمیں بھی کہنے لگے، میں نے اندازہ لگایا کہ غزل ہو یا نظم گفتار خیالی زندگی کے نشیب و فراز کی پرواہ کیے بغیر پُر خار راہ پر گامزن رہتے ہیں۔ پھولوں کی معیت میں رہنا ان کی فطرت تھا، لیکن وہ کانٹوں سے لہولہان ہونے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کا دوسرا مجموعہ ''نیا پیراہن'' لاہور سے آغا امیر حسین نے اپنے ادارے کلاسیک سے شائع کیا تو یہ ایک مضافاتی شاعر کی حوصلہ افزائی نہیں تھی بلکہ گفتار خیالی ملک کے تمام معیاری رسائل میں چھپ کر اپنی شاعری کا سکہ تسلیم کروا چکا تھا اور آغا امیر حسین نے میرٹ پر ان کی دوسری کتاب اشاعت کے لیے قبول کی تھی۔ ظہیر کاشمیری نے لکھا تھا:

''وہ (گفتار خیالی) شرف انسانی کی اعلیٰ اقدار کا ترجمان ہے اور تقدیر

پرستی کے فلسفے کے خلاف پسماندہ طبقوں کو جہاد حریت کا پیغام دیتا ہے۔
وہ عمل تغیر کا وظیفہ خوان ہے اور مبنی بہ انصاف معاشروں کی بنیاد پر عالمی
امن کا خواب دیکھتا ہے۔''

ظفر اقبال نے گفتار خیالی کی دور افتادگی کو خاطر میں لائے بغیر کہا ''اس کے اظہار فن کی بلوغت اسے پختہ کار شعراء میں شامل کرنے کے لیے کافی ہے۔ گفتار خیالی کے موضوعات اور طرز ادا میں جدید طرز احساس کی طرف جست بھرنے کی ایک واضح کوشش صاف دیکھی جاسکتی ہے۔''

ان کے استاد خیال امروہوی نے اپنے شاگرد کے فن کو سراہا تو یہ بات تسلیم کی کہ گفتار صاحب نے ذات کے حوالے سے موجودہ اور آئندہ کی امیدوں اور آرزوؤں کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ جیلانی کامران جیسے کڑے نقاد نے رائے دی کہ گفتار خیالی نے دل اور دوران دونوں کے ساتھ اپنے جس شعری رشتے کو قائم کیا ہے، اس نے ایک نہایت پُر تاثر غزل کو رونما کرنے میں مدد دی ہے۔'' میں یہاں ممتاز شاعر مرتضٰی برلاس کی رائے بھی درج کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے گفتار خیالی کی شاعری میں جذبہ وفکر کی آمیزش کی شہادت دی اور لکھا کہ وہ خاموشی کے اس طلسم کو توڑنے کی سعی بھی کرتا ہے، جو انسانوں پر طاری ہوتا ہے تو بے حسی اور لاتعلقی کی بسیط فضا پیدا کردیتا ہے۔ مثلاً

ہم ہیں سورج ہمارے ساتھ چلو
ہم جہاں ہوں گے شب نہیں ہوگی

میں نے ایک دور افتادہ مقام کے شاعر گفتار خیالی کے بارے میں اس دور کے چند نامور ادیبوں کی آرا درج کی ہیں تو مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس دور میں گفتار خیالی کی صورت میں ایک سنجیدہ فکر شاعر دائرہ دین پناہ (کوٹ ادو) میں پرورش پا رہا تھا جس سے بہت سی توقعات اہل ادب نے وابستہ کرلی تھیں لیکن المیہ یہ ہوا کہ وہ 30 جولائی کو اپنے سائیکل پر سوار گھر کی طرف آرہے تھے کہ سامنے سے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل آیا اور انہیں ٹکر مار کر آگے گزر

گیا۔ چوٹ دماغ پر لگی تھی ۔ وہ زمین پر گرے تو بے ہوش ہو گئے ۔ انہوں نے 22 ستمبر تک ملتان کے ایک ہسپتال میں موت کا مقابلہ کیا اور زندگی کو مسلسل آواز دی لیکن ہسپتال کے معالج اس سانحے کے بعد انہیں زندگی سے سرفراز نہ کر سکے۔ ایک ابھرتا ہوا زیرک شاعر جس کے تیسرے مجموعے ''کسک'' کی مجوزہ اشاعت پر ڈاکٹر اسلم انصاری، فرمان فتح پوری، منو بھائی، علی تنہا، کشور ناہید، نصیر الدین شاہ، قاضی جاوید اور کشور ناہید نے تقریضات لکھی تھیں موت کی آغوش میں چلا گیا۔ میں انہیں یاد کر رہا ہوں تو ان کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گردش کر رہا ہے اور احساس ہو رہا ہے کہ ادب کا ایک سچا خدمت گزار، جس کی درویشی، سادگی اور وجدانی کیفیت کا ذکر جسارت خیالی نے اپنی کتاب ''لا زماں سے زماں تک میں کیا ہے، اس دنیا سے حادثاتی جبر میں اٹھ گیا تھا۔ حق تعالیٰ مغفرت کرے۔ گفتار خیالی نے دائرہ دین پناہ اور کوٹ ادو کو ادب کے نقشے پر نمایاں مقام عطا کر دیا تھا۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔

محمد عالم مختار حق

حضرت علی ہجویری (داتا گنج بخش) کی نگری لاہور سے 6 مارچ 2014ء کو ایک اور سعید شخصیت عالم بالا کو سدھار گئی۔ یہ عالم بے بدل اور فاضل بے مثال، کتاب شناس، کتاب دار میاں محمد عالم صاحب تھے جنہیں پیر غلام دستگیر نامی نے تاریخی نام مختار حق دیا تھا۔ ان کا آستانہ فیض بند روڈ پر جھگیاں شہاب الدین میں تھا جو اب ''شہاب ٹاؤن'' سے موسوم ہوتا ہے (لیکن اس کا معروف بیوروکریٹ ادیب قدرت اللہ شہاب سے کوئی تعلق نہیں) یہ قصبہ نما محلہ جناب محمد عالم مختار حق کی باطنی روشنیوں سے منور تھا اور وہ اس محلے کی جامع مسجد میں امامت فرماتے اور خطبۂ جمعہ میں قرآن کریم کے احکام، نبی آخر الزماںؐ کی تعلیمات آئمہ کرام کے فیوض روحانی سالکان راہ حق تک پہنچاتے تھے۔ اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالی نے تعلیم کے ابتدائی درجوں میں ہی ان کے دل میں کتاب کی محبت پیدا کردی اور پھر کتابوں کی جمع آوری اور ان کا مطالعہ عشق کا درجہ اختیار کر گیا جو ان کی زندگی کے آخری لمحات تک روز افزوں رہا۔ ایک ملاقات میں انہوں نے اس ناچیز انور سدید کے استفسار پر کہ ''ان کے مطالعے اور کتابیں جمع کرنے کا شوق کس طرح پروان چڑھا؟'' فرمایا، ایک دن میں سکول جا رہا تھا۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ اچانک کاغذ کا ایک بڑا سا ٹکڑا اڑتا ہوا آیا اور میرے سینے سے چمٹ گیا۔ دیکھا تو یہ کسی اخبار کا ورق تھا جس پر قرآنی آیات اور ان کا ترجمہ جلی حروف میں چھپا ہوا تھا۔ اس وقت میری عمر زیادہ نہیں تھی لیکن اتنی بات میری سمجھ میں آ گئی کہ یہ قرآنی آیات کی بے حرمتی ہے۔ میں نے ورق کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا، آنکھوں سے لگایا اور تہہ کر کے بستے میں رکھ لیا..... بس یہی لمحہ تھا جب میرے رب نے میرے دل میں اوراق مقدسہ لکھے اور چھپے ہوئے ہی نہیں..... بلکہ دستیاب ہر مطبوعہ ورق محفوظ کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ جناب محمد عالم مختار جامع مسجد شہاب نگر کے پیش امام تھے لیکن وہ کٹ

ملا نہیں بلکہ ایک روشن خیال دانشور تھے جن کا مطالعہ ادب وسیع تھا اور وہ اپنے مقتدیوں کو بھی تنگ نظری، تعصب اور فرقہ پرستی سے گریز کرنے کی تلقین کرتے اور اس مہر منور کی طرف لاتے، جس کی پہلی کرن چودہ سو سال قبل غارِ حرا سے پھوٹی تھی اور آج تک کائنات کو منور کر رہی ہے۔ محمد عالم مختار حق صاحب کے لیے مسجد میں امامت دین اسلام کی تبلیغ کا وسیلہ تھا اور انہوں نے اپنے خاندان کی کفالت کے لیے ڈاک کے سرکاری محکمے میں ملازمت اختیار کی اور 6 جون 1992ء کو ڈائریکٹر اکاؤنٹس کے دفتر سے ریٹائر ہو گئے۔ تو اپنی پنشن پر گزراوقات کرنے لگے۔

محمد عالم جھگیاں شہاب الدین میں جو بند روڈ سے چوک یتیم خانہ کی طرف آنے والی سڑک کے دائیں طرف آباد ہے 4 مارچ 1931ء کو پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں فصیل میں گھرے ہوئے شہر لاہور کی یہ ایک دور افتادہ بستی شمار ہوتی تھی جس کے چاروں طرف کھیت تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی سے حاصل کی لیکن پرائمری کا امتحان ایم سی سکول ڈھولن وال سے مڈل، کا امتحان اسلامیہ سکول ملتان روڈ سے اور میٹرک اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ لاہور سے 1949ء میں پاس کیا۔ اس دوران دینی، علمی اور ادبی کتابوں کے مطالعے اور اپنی لائبریری بنانے کا شوق پیدا ہو چکا تھا۔ اس شوق کے تحت ہی انہوں نے دار العلوم السنہ شرقیہ سے فاضل فارسی کی سند حاصل کی لیکن اس سے قبل وہ محکمہ ڈاک میں ملازمت کر چکے تھے اور یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ کوئی کتاب مانگ کر نہیں پڑھیں گے اور اپنے ذوق کی کتاب خرید کر اپنے کتب خانے میں شامل کریں گے۔ وہ اپنی تنخواہ سے گھر کے اخراجات پورے کرتے۔ خانہ داری کے امور انجام دیتے لیکن ذوق کی پرورش کے لیے کتابوں کی خریداری کے لیے فارغ وقت میں جو بالعموم انہیں دفتری اوقات کے بعد میسر آتا تھا مشقت کے دیگر کام کرتے۔ ان میں سب سے اہم کتابت شدہ مسودات کی لفظ خوانی (پروف ریڈنگ) تھا۔ ان کی لفظ خوانی کو کتاب پر نظر ثانی ڈالنے کا درجہ حاصل تھا۔ یعنی وہ لفظ خوانی کے دوران مصنف کی غلطیوں کی اصلاح بھی کر دیتے تھے۔ کتابوں کی خریداری کا سلسلہ زندگی کے آخری وقت تک جاری رہا اور اب ان کے کتب خانے میں چودہ

ہزار سے زائد کتابیں موجود ہیں جو موضوعات کے اعتبار سے الماریوں میں رکھی گئی ہیں اور ان کے گھر کے تین کمرے ان کتابوں سے بھرے پڑے ہیں۔

مجھے محمد عالم مختار حق کے کتب خانے سے استفادہ کا موقع متعدد مرتبہ مل چکا ہے۔ وہاں جا کر یہی احساس ہوتا جیسے میں مولانا محمد حسین آزاد کے کتب خانے میں پہنچ گیا ہوں۔ ایک طرف انہوں نے گوشہء چمن آراستہ کر رکھا تھا۔ دوسری طرف کتب خانہ سجا ہوا تھا۔ کتابوں کے درمیان بیٹھے ہوئے وہ خود بھی ایک کتاب ہی کے مشابہ نظر آتے۔ راہ علم کے ہر مسافر کے لیے ان کے کتب خانے کے دروازے کھلے تھے۔ کرسی سے اٹھ کر خود استقبال کرتے۔ پاس پڑے ہوئے صوفے پر بٹھاتے اور چائے آنے سے پہلے مطلوبہ کتابیں الماریوں سے نکال کر ان کے سامنے میز پر رکھ دیتے کہ جب تک چاہیں استفادہ کریں۔ ایک کتاب مانگنے والے کو دس کتابیں پیش کر دیتے۔ بالعموم نایاب کتابیں کتب خانے سے باہر لے جانے کی اجازت نہ دیتے اور کتاب کے مطلوبہ حصے فوٹو کاپی کرا کے پیش کر دیتے تھے۔ مقصود نظر یہ تھا کہ لکھنے والا موضوع کے ساتھ انصاف کر سکے اور کتابوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے موضوع کو تشنہ نہ رہنے دے۔ میں ان سے ملتا تو یوں محسوس ہوتا کہ محمد حسین آزاد کے قبیلے ہی کے کسی علم دوست سے مل رہا ہوں۔ ویسی ہی سفید داڑھی، ویسا ہی طبیعت میں ٹھہراؤ اور ویسا ہی انکسار بس فرق یہ تھا کہ آزاد پگڑی باندھتے تھے اور کاندھے پر فضیلت کی قبا ہوتی تھی۔ محمد عالم مختار حق نے سر کو ٹوپی سے ڈھانپ رکھا تھا اور قبا کا بوجھ اٹھانے کی بجائے ہاتھ میں سائیکل تھام رکھی ہوتی جس پر وہ صبح دفتر جاتے۔ دوپہر کو دفتر ''نقوش'' کا رخ کرتے جہاں محمد طفیل مدیر ''نقوش'' نے ان کے لیے کرسی اور میز الگ ڈال رکھی تھی۔ شام کو اسی سائیکل پر گھر آ جاتے۔ ویگنوں پر چڑھنے کی بجائے وہ اپنی سواری کو ترجیح دیتے تھے کہ اس میں انتظار کی زحمت نہ اٹھانا پڑتی تھی۔ ان کے پاس جو سائیکل تھی وہ اس شہر کی شاید سب سے پرانی سائیکل تھی۔ شہر میں ڈاکٹر سلیم اختر کی پرانی سائیکل بھی سال خوردہ اور کہنہ تھی۔ سلیم اختر صاحب نے اس پرانی سائیکل پر منو بھائی سے کالم لکھوایا اور کمپنی سے نئی سائیکل لے لی لیکن

محمد عالم مختار حق صاحب نے پرانی کتاب کی طرح پرانی سائیکل سے ہی نباہ کیا اور ریٹائرمنٹ کے بعد اسے ایک مخلوطے کی طرح محفوظ مقام پر رکھ دیا۔ عمر بھر کے ساتھی کے گزر جانے پر آج یہ سائیکل ضرور افسردہ ہوگی۔

میں نے محمد عالم مختار حق کا نام پہلی مرتبہ کراچی میں اپنے کرم فرما مشفق خواجہ سے سنا تھا۔ یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے بیٹھے بیٹھے ان سے لاہور میں ٹیلی فون پر ملاقات بھی کرادی تھی۔ وہ میرے نام اور معمولی کام سے آشنا تھے۔ ٹیلی فون پر ہی تین چار کتابوں کے نام گنوادیئے۔ میرے پندار کو بڑی طمانیت ملی۔ لاہور میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو بڑی اپنایت سے ملے۔ ان کی بزرگی میں شفقت کے تمام عناصر موجود تھے لیکن جب باتوں باتوں میں انہوں نے اپنی تاریخ پیدائش (4 مارچ 1931ء) بتائی تو معلوم ہوا کہ عمر میں مجھ سے دواڑھائی سال چھوٹے ہیں (میری تاریخ پیدائش 4 دسمبر 1928ء درج ہے) لیکن میں نے انہیں ہمیشہ اپنا بزرگ ہی تسلیم کیا اور ان کے علم کی خوشہ چینی پر طمانیت محسوس کی۔ مشفق خواجہ لاہور تشریف لاتے تو ان سے ملاقات کے لیے جھگیاں شہاب دین جاتے اور سابقہ ملاقات کے بعد دریافت ہونے والے مخطوطوں کے بارے میں معلومات کا تبادلہ کرتے۔ ایک مرتبہ میں نے لاہور کے ادبی معاشرے کے بارے میں مشفق خواجہ صاحب سے ان کی معلومات کا ماخذ دریافت کیا تو انہوں نے بصد ارتجال محمد عالم مختار حق صاحب کا نام لیا اور بتایا کہ وہ انہیں اخبار ''امروز''، ''نوائے وقت''، ''مشرق'' اور ''جنگ'' وغیرہ کے ادبی صفحے ہر ماہ بھجواتے ہیں اور یہی ان کی معلومات کا ماخذ ہیں۔ محمد طفیل مدیر ''نقوش'' کے سب سے چھوٹے صاحبزادے کے ولیمے میں ان سے ملاقات ہوئی تو دوران گفتگو میری ناچیز تالیف ''اردو ادب میں سفرنامہ'' کے ایک باب ''اردو میں حج ناموں کی روایت'' کا ذکر آ گیا جو ''نقوش'' میں چھپنے سے پہلے پروف خوانی کے دوران محمد عالم مختار حق پڑھ چکے تھے۔ کہنے لگے ''میرے کتب خانے میں دس پندرہ ایسے حج نامے ہیں جن کا ذکر اس مقالے میں نہیں آیا۔ مناسب سمجھیں تو دیکھ لیں'' ان کتابوں کا شوق مجھے ان کے کتب خانے میں لے گیا

اور انہوں نے سب کتابیں میرے سامنے رکھ دیں اور ''نوٹ'' لینے شروع کر دیئے۔ جو میرے پاس محفوظ پڑے ہیں کیوں کہ ''اردو ادب میں سفرنامہ'' کا دوسرا ایڈیشن نہیں چھپا۔

محمد عالم مختار حق کے والد محترم الحاج میاں محمد حسین (1882ء تا 1958ء) کو بھی کتابوں سے عشق تھا۔ ان کے دینی مزاج کو تصوف اور فقہ کی کتابوں کی تلاش رہتی تھی اور وہ اکثر پرانی کتابوں کی دکانیں چھانتے رہتے تھے۔ تلاش کتب کا ذوق انہوں نے محمد عالم مختار حق کے دل میں پیدا کیا اور ڈیڑھ صد سے زیادہ کتابیں ورثے میں دیں۔ محمد عالم مختار حق نے ان دکانوں کا طواف شروع کیا تو کئی نادر کتب ان کو دستیاب ہوئیں۔ کہنے لگے ''میں نے ''تحقیقات چشتی'' فٹ پاتھ سے چار آنے میں خریدی تھی'' اس دوران ان کی ملاقات مولوی شمس الدین سے ہوگئی جن کے پاس پرانی، نایاب و نادار اور قیمتی کتابوں کا ذخیرہ فروخت کے لیے موجود رہتا تھا۔ محمد عالم صاحب حسبِ استطاعت ان سے کتابیں خریدتے رہتے تھے اور یہ سلسلہ 1986ء تک جاری رہا جو مولوی شمس الدین کا سال وفات ہے۔ (محمد عالم مختار حق نے مولوی شمس الدین پر بعد از وفات ایک کتاب (نذر شمس) بھی شائع کی تھی) لیکن اس وقت تک محمد عالم صاحب ان کی بیشتر قیمتی کتابیں خرید کر اپنے کتب خانے میں منتقل کر چکے تھے۔ درحقیقت نایاب کتب کی تلاش اور ہر قیمت پر خریداری ان کا عشق بن چکا تھا اور انہوں نے کئی نجی کتب خانوں سے نادر و نایاب نسخے حاصل کیے تھے۔ انہی میں شیخ محمد اکرام کا کتب خانہ بھی تھا جو سلسلہ ''کوثر'' کی تین کتابوں کے مصنف ہیں اور غالب اور شبلی پر تحقیقی کتابیں پیش کر چکے ہیں۔ مرحوم کی بیوہ کتابوں کا بوجھ سنبھال نہ سکیں۔ محمد عالم مختار حق صاحب نے ان سے ایک سو سے زیادہ کتابیں خریدیں۔

ممتاز غالب شناس، محقق، دانشور اور صحافی مولانا غلام رسول مہر سے انکا سلسلہ تعلق بھی داستانی نوعیت کا ہے۔ محمد عالم صاحب کو حاکم پنجاب آدینہ بیگ (م 1785ء) سے متعلق معلومات درکار تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے مہر صاحب کو اس موضوع کے ماخذات کے لیے خط لکھا۔ انہوں نے نوجوان طالب علم سمجھ کر محبت سے جواب دیا۔ محمد عالم صاحب نے ایک اور

خط لکھا۔ مہر صاحب نے ایک اور جواب مرحمت فرمایا۔ پھر مراسلت ملاقات میں تبدیل ہوگئی لیکن خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ مہر صاحب نے انہیں اپنے کتب خانے کی فہرست سازی پر لگا دیا۔ محمد عالم صاحب گھر سے خط لکھ کر لے جاتے اور مہر صاحب کی میز پر رکھ دیتے۔ اس دوران مہر صاحب کو اپنے ترجمہ وتالیف کے کام سے فراغت ملتی تو محمد عالم صاحب کے خط کا جواب لکھتے جو وہ اپنے گھر جا کر پڑھتے۔ کہنے لگے ''میرے پاس مہر صاحب کے خطوط کا سب سے بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ ایک ڈائری پر ان کے متفرق خیالات درج ہیں۔ ایک اور ڈائری پر ان کے لیے پسندیدہ اشعار اور شرحیں لکھی ہوئی ہیں ''مکاتیب مولانا غلام رسول مہر۔۔۔۔۔۔ بنام محمد عالم مختار حق'' کے نام سے دو کتابیں جو 314 خطوط پر مشتمل ہیں چھپ چکی ہیں۔ ان کتابوں کے تحقیقی حواشی محمد عالم مختار حق نے لکھے ہیں۔ اب یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مہر کے پہلے خط کا پورا متن یہاں پیش کر دیا جائے جو 17 جنوری 1961ء کو ماڈل ٹاؤن لاہور سے لکھا گیا تھا۔ یہ خط مولانا مہر کے مطالعے، ان کی علمی، ادبی اور تاریخی معلومات اور ان کے کردار کے انکسار اور کشادہ نظری پر بھی روشنی ڈالتا ہے:

مسلم ٹاؤن لاہور 17/ جنوری 1961 غلام رسول مہر

باسمہ سبحانہٗ

مکرمی! ان تکلفات کی کیا ضرورت تھی؟ میں خود ایک معمولی طالب علم ہوں اور جو کچھ مجھے معلوم ہے اپنے ہم سروں اور رفیقوں کی خدمات عالیہ میں پیش کرتے ہوئے خوشی ہوتی ہے۔ عالم الکل اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی نہیں۔ اپنی حالت تو یہ سمجھتا ہوں کہ شوق علم میں ابتدائے سن شعور سے دامن پھیلا رکھا ہے۔ جہاں سے کوئی متاع مل جاتی ہے، اسے اللہ تعالیٰ کا فضل خاص تصور کرتا ہوں۔

اب اپنے استفسارات کا مجمل جواب ملاحظہ فرمائیے:

(1) آدینہ بیگ کے حالات بے شمار کتابوں میں ملیں گے۔ مشہور کتابوں میں سے آپ

لطیف کی انگریزی تاریخ پنجاب ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے علاوہ ہر اس کتاب میں کچھ نہ کچھ درج ہے جس میں سکھوں کے ابتدائی ظہور اور مرہٹوں کے پنجاب پر حملے کے حالات درج ہیں۔ علاوہ بریں جالندھر، گزیٹیر اور لاہور گزیٹیر میں بھی اس کے حالات ہونے چاہئیں۔ جالندھر میں بھی وہ حاکم تھا۔ مآثر الامرا میں بہ ضمن حالات عمادالملک (بن غازی الدین خان فیروز جنگ بن نظام الملک آصف جاہ اول) آدینہ کے مفصل حالات مل جائیں گے۔ سکھوں کی کوئی تاریخ اور مرہٹوں کی کوئی سرگزشت اٹھالیجیے۔ جس میں حملہ پنجاب کی تفصیلات ہوں آدینہ بیگ ضرور موجود ہوگا۔ بہت زیادہ تفصیلات درکار ہوں تو ضروری ہوگا کہ کلکتہ ریویو کے پرانے فائل دیکھیں جو پنجاب پبلک لائبریری اور یونیورسٹی میں موجود ہیں۔

اس کے حالات ایک سے زیادہ مرتبہ تفصیلاً رسائل میں بھی چھپ چکے ہیں۔ اب سوچتا ہوں تو یاد نہیں آتا کہ کن رسائل میں چھپے تھے۔ ایک مرتبہ تو پروفیسر سید عبدالقادر شاہ مرحوم ومغفور نے اس پر بہت کچھ لکھا تھا۔ میں اطمینان سے بیٹھ کر دیکھوں گا اور سوچوں گا تو امید ہے یاد آجائے۔

(2) مفتی غلام سرور کے حالات (1) تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کہاں سے ملیں گے ان کی تین کتابوں (2) کا علم مجھے ہے اور غالباً تینوں میرے پاس ہیں۔ ایک ''خزینۃ الاصفیا'' دو جلد...... دوسری ''گلزار شاہی''..... تیسری ''گنجینہ تاریخ'' (3) یا ایسا ہی کوئی نام ہے۔ لاہور میں ان کے جاننے والے بہت ہوں گے۔ میں بھی کسی صاحب سے پوچھوں گا۔

جس حد تک مجھے یاد ہے مولانا ظفر علی خان مرحوم ومغفور کا کلام تین مجموعوں میں شائع ہوا تھا۔ اول ''بہارستان'' جو بہت بڑا مجموعہ ہے۔ دوسرا ''نگارستان'' تیسرا ''ارمغان قادیان'' جس میں قادیان اور قادیانیت کے متعلق تمام نظمیں جمع کر دی گئی تھیں۔ یہ مجموعہ لاہور ہی میں طبع ہوئے تھے۔ (4) اب معلوم نہیں کہاں اور کس کے پاس ملیں گے۔

جس حد تک مجھے معلوم ہے غالباً کلام کا کوئی حصہ غیر مدون نہیں رہا۔ البتہ میرا خیال

ہے کہ بعض ایسی چیزیں جو مزاحاً احباب خاص کے لیے لکھی گئی تھیں مجموعہ ہائے کلام میں شامل نہ کی گئیں۔ بالکل یہی کیفیت رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم و مغفور کے مزاحیہ کلام کی تھی۔

میرے پاس مولانا (ظفر علی خان) کی بعض چیزیں خود ان کے قلم سے لکھی ہوئی موجود تھیں۔ میں نے مقابلہ کیا تو وہ سب مذکورہ بالا مجموعوں میں آ گئی ہیں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

مکرر یاد آیا کہ جو نظمیں مرحوم مولانا (ظفر علی خان) نے تین مجموعے چھپ جانے کے بعد لکھیں اور وہ زمیندار میں شائع ہوئیں۔ وہ غالباً کسی بھی مجموعے میں نہ آئیں۔

○

اب مولانا غلام رسول مہر کے محولہ بالا خط پر محمد عالم مختار حق کے حواشی ملاحظہ کیجیے:

(i) اس دور میں مفتی غلام سرور (مرحوم) کے حالات پر مواد دستیاب نہ تھا۔ البتہ بعد کے تذکرہ نویسوں نے اس کمی کو پورا کردیا۔ اب مفتی صاحب کے حالات کے لیے ان کتابوں کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

(ii) خزینۃ الاصفیا جلد اول، مصنف مفتی غلام سرور لاہوری.... مترجم: مفتی محمود عالم ہاشمی و علامہ اقبال احمد فاروقی، ناشر: المعارف، گنج بخش روڈ۔ لاہور 1392ھ (دیباچہ ص 9 تا ص 40۔ مع شبیہ مفتی غلام سرور)

(iii) تذکرہ علماء اہل سنت و جماعت لاہور۔ مصنف پیرزادہ علامہ اقبال محمد فاروقی۔ ناشر، مکتبہ نبویہ گنج بخش روڈ، لاہور 1975ء

(iv) تذکرہ علمائے پنجاب، اختر راہی ناشر: مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور۔ 1980ء

(2) مفتی صاحب اکیس کتابوں کے مصنف ہیں (ص 18۔ خزینۃ الاصفیا اردو ترجمہ)

☆ تذکرہ اکابر اہلسنت، مولانا عبدالحکیم شرف قادری، ناشر: مکتبہ قادریہ لاہور۔ 1976ء

(3) درست نام گنجینہ سروری معروف باسم تاریخ صحیح تاریخ (1284ھ) ہے۔

(4) یہ کتابیں بالترتیب اردو اکیڈمی پنجاب لاہور۔ پبلشرز یونائیٹڈ لاہور اور مسلم پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپیں۔

اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ مولانا غلام رسول مہر پر بہاول پور یونیورسٹی کے پروفیسر شفیق احمد، پی، ایچ، ڈی سطح کا تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے تو ضروری مواد دستیاب نہیں تھا۔ پوچھ پاچھ کر محمد عالم مختار حق صاحب کے پاس جھگیاں شہاب الدین پہنچے اور اپنا مقالہ مکمل کر کے واپس بہاول پور گئے۔ انہیں اپنی ضرورت کے علاوہ بہت سا نیا مواد بھی مختار حق صاحب کے کتب خانے سے مل گیا تھا۔

محمد عالم مختار حق کے علم ودانش اور ان کی کتاب سے دوستی کے علاوہ الفاظ خوانی کی شہرت ان کی ملازمت کے زمانے میں ہی پھیل چکی تھی۔ مشفق خواجہ انہیں کراچی سے مسودے بھجوایا کرتے تھے۔ ''نقوش'' کے مدیر محمد طفیل اپنے وقیع الشان رسالہ ''نقوش'' کے خاص نمبروں کی ترتیب وتدوین کے لیے ان سے مشورے لیتے تھے۔ وہ اپنے اس اعزاز پر صرف عجز وانکسار کا اظہار کرتے کہ نقوش کے ''رسول نمبر'' کی سب جلدوں کی لفظ خوانی انہوں نے کی تھی۔ محمد طفیل نے اعتراف کیا

> ''جتنا استفادہ جناب محمد عالم مختار حق کے کتب خانے سے کیا گیا، وہ احسان بھلایا نہ جاسکے گا۔ چونکہ مولانا کا کتب خانہ بڑی نادر کتابوں سے آراستہ ہے۔ عالم صاحب تو ہر دم ہمارے ساتھ تھے۔''

''نقوش'' کے رسول نمبر کئی جلدوں میں شائع ہوئے اور ان میں محمد عالم مختار حق کی محنت کا ذکر اس دور کے فوجی صدر ضیاء الحق کے سامنے ہوا تو صدر پاکستان نے ان کے لیے حج کا انتظام کیا ان کی خطاطی پر حکومت پنجاب نے انہیں 2008ء میں گولڈ میڈل پیش کیا۔ ان کے کتب خانے کو دیکھنے کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی بھارت سے ڈاکٹر محمد یاسین صدیقی، حیدر آباد دکن سے جناب عبدالصمد خان، تہران یونیورسٹی ایران سے جناب علی بیات، ٹوکیو یونیورسٹی جاپان سے ٹینسو

یا نوبوگوچی، مصر سے ڈاکٹر حازم محمد احمد اور امریکہ سے مسٹر بیوکر تشریف لا چکے ہیں۔

موضوعاتی اعتبار سے اس لائبریری کا مقدس ترین ذخیرہ نسخہ ہائے قرآن مجید اور کتب قرآنیات وغیرہ پر ہے۔تراجم میں اردو اور فارسی کے طلباء انگریزی، سندھی اور پنجابی کی تفاسیر بھی ہیں۔ قرآن کا ایک نادر نسخہ ایک پوسٹر پر شائع شدہ ہے۔ جو جرمنی میں شائع ہوا تھا۔ ایک نسخے کا نام ''الفی قرآن'' ہے۔اس کی کتابت میں یہ التزام برتا گیا ہے کہ ہر صفحہ اور سطر الف سے شروع ہو۔ایک قرآن کریم صرف ایک ورق کے دو صفحات پر طبع شدہ ہے۔قرآن کریم کی تفہیم کے لیے زبانوں کی لغات بھی موجود ہیں۔ادبی شخصیات میں سے اقبالیات، غالبیات اور مہریات کے علاوہ ابوالکلام آزاد کے جریدہ ''الہلال'' کی تمام جلدیں بھی دستیاب ہیں۔ذخیرہ مہریات کی تمام کتابیں مولانا غلام رسول مہر کے دستخطوں سے مزین ہیں۔

محمد عالم مختار حق کی تالیفات میں نقوش جمیل، خطبات یوم رضا، مولانا ابوالکلام آزاد (مقالات مولانا مہر)، نگارشات ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مشفق خواجہ کے خطوط کا مجموعہ ''مشفق نامے'' خواجہ صاحب کی وفات پر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ''مشفق من، خواجۂ من'' نذر شمس، غالبیات مہر، مولانا محمد مسلم بی اے، نادر رسائل میلادالنبی، مکاتیب مختار الدین احمد بنام علامہ اقبال احمد فاروقی اور نگارشات فاروقی شامل ہیں۔ ان کی کل تعداد 26 ہے اور آخری کتاب 2013ء میں چھپی تھی۔ ادبی مضامین اور تنقیدی وتحقیقاتی مقالات میں مشاہیر ادب کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں غلط لکھ دی جاتیں تو ان کو بہت قلق ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اصلاح احوال کے لیے انہوں نے وفات پا جانے والے مشاہر کی تاریخ کا ریکارڈ رکھنا شروع کر دیا تھا اور سال ختم ہوتا تو یہ تاریخ ہائے وفات'' الرشید'' یا'' قومی زبان'' کراچی میں چھپوا دیتے تھے۔اپنی لائبریری میں تشریف لانے والے اہل علم کے تاثرات حاصل کرنے میں بھی انہیں دلچسپی تھی۔ چنانچہ لائبریری سے باہر نکلنے والے دروازے کے پاس ایک وزیٹر بک (Visitor Book) رکھی رہتی جس پر مہمانان گرامی دم رخصت اپنے تاثرات رقم کر دیتے۔اس کتاب میں مولانا غلام رسول مہر نے لکھا:

''خدائے بزرگ و برتر کی رحمت سے مجھے اپنے عزیز دوست اور خوش ذوق
رفیق محمد عالم مختار حق صاحب کی اعانت میسر آ گئی جن کی مساعی جمیلہ سے
یہ کٹھن مسافت میرے بہ ہمہ وجوہ آسان ہوگئی۔''

ممتاز محقق، شاعر اور شگفتہ نگار مشفق خواجہ کا تاثر یہ تھا کہ ''میں اپنے محترم دوست محمد عالم مختار حق کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نہایت توجہ سے کتابت شدہ اوراق کا مطالعہ کر کے کاتب کی غلطیوں کے ساتھ میری بھی متعدد غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔''

ڈاکٹر مختار الدین احمد کی رائے میں ''وہ مصنف اور شاعر خوش نصیب ہیں جس کے خطوط محمد عالم مختار حق مرتب کریں۔''

پاکستان کے ادیبوں میں سے اُوپر لکھے گئے ناموں کے علاوہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، مولانا محمد اسحاق بھٹی، سید قاسم محمود، محمد راشد شیخ، ڈاکٹر انور محمود خالد، علامہ اقبال احمد مجددی، محمد اکرام چغتائی، ڈاکٹر محمد مسعود احمد، مظہر سلیم مجوکہ، بشیر حسین ناظم، ملک مقبول احمد، محیط اسماعیل نے بھی اس کتب خانے کی سیاحت کی اور محمد عالم مختار حق صاحب کی خدمات کی تحسین کی۔

محمد عالم مختار حق مثبت قدروں پر عمل کرنے والے سادہ طبع انسان تھے۔ ان کے ادبی فیض کے دو اور زاویے کتابوں پر دیباچہ نگاری اور نقد و تبصرہ ہیں۔ ان کے پیش الفاظ اور تبصرے کتاب کے باطن کو منور کر دیتے اور مصنف کو تحسین سخن شناس کا احساس دلاتے تھے لیکن دوسری طرف بزرگان دین اور اہل فکر و فن کی کتابوں پر وہ عقیدت مندانہ تعارف کا فریضہ ادا کیا کرتے تھے۔

محمد عالم مختار حق صاحب اپنا ادبی کام پوری لگن سے کر رہے تھے لیکن شاید انہیں یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ اس دار فانی کو خیر باد کہنے کا وقت آ گیا ہے۔ کئی دنوں سے بچوں کو کہہ رہے تھے کہ خاندان سے ایک فرد کم ہونے والا ہے۔ پانچ مارچ کی رات کو رات گئے تک باتیں کرتے رہے تھے۔ بار بار کہتے کہ ان کے والد صاحب (الحاج میاں محمد حسین) کی لحد کے

ساتھ ایک قبر کی جگہ خالی ہے۔ یہ کہتے کہتے سو گئے تو دنیا کا کوئی بوجھ ان کے دل پر نہیں تھا۔ نصف شب کو چھاتی میں گھٹن محسوس کی اور اپنے بیٹے محمود عالم کو آواز دی۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دوڑے لیکن طبی امداد پہنچنے سے پہلے محمد عالم مختار حق کو خالق کائنات نے اپنے پاس بلالیا تھا۔ آخری وقت پر ان کے لب ہل رہے تھے۔ وہ کلمہ شہادت پڑھ رہے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محمد عالم مختار حق زندہ تھے تو لوگ پوچھتے تھے کہ ان کے بعد اس کتب خانے کا کیا بنے گا۔ محمد عالم اس سوال کو حیرت سے سنتے اور اپنے بڑے بیٹے کی طرف دیکھتے جسے انہوں نے اپنی زندگی میں اپنا ادبی معاون بنالیا تھا۔ ان کے دل میں کتاب کی قیمت پیدا کردی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ محمود عالم تھابل اپنے والد کے کتب خانے کا فیض عام جاری رکھیں گے۔

مظفر وارثی

28 جنوری 2011ء کو مظفر وارثی کی وفات سے اردو غزل کا ایک روشن باب بند ہو گیا اور اس سے بھی ایک بڑی حقیقت کہ اس دنیا سے ایک بڑا نعت نگار اٹھ گیا ہے۔ پاکستان میں صبح کا دروازہ مظفر وارثی کی شیریں آواز میں اس حمد سے کھلتا تھا

''کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے''

فجر کی اذان کے بعد مظفر وارثی اپنے مخصوص لحن میں نبی آخرالزمان محمد مصطفےٰؐ کی عظمت کا اعتراف اپنی نعت کے وسیلے سے کرتے اور ان کی یہ آواز ہر گھر میں سنی جاتی۔

''مرا پیمبر، عظیم تر ہے''

دکھ کی بات یہ ہے کہ حمد و نعت کے اس معروف شاعر کی روح ان کے جسد خاکی سے 28 جنوری 2011ء کو پرواز کر گئی۔ اور اگلے روز سینکڑوں سوگواروں نے انہیں لحد میں اتار دیا اب ان کی آواز ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تو گونجتی رہے گی۔ اس آواز کے ساتھ ان کا سراپا بھی ہماری نظروں کے سامنے خلاء میں گردش کرتا رہے گا لیکن ہم مظفر وارثی کو خود حمد و نعت پڑھتے ہوئے دیکھ نہ سکیں گے۔ نہ ان کی زبان سے غزل سن سکیں گے۔

مظفر وارثی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ شاعری کا ذوق انہوں نے اپنے والد علامہ صوفی وارثی سے ورثے میں پایا تھا لیکن ان کی غزل کی جدیدیت ظاہر کرتی ہے کہ وہ وہبی شاعر تھے۔ دوسری طرف انہوں نے اس حقیقت کو کبھی پردہ پوش نہیں کیا کہ میرٹھ کے ایک نوچندی میلے میں مشاعرہ منعقد ہوا اس میں ہندستان کے نامور شعرا جگر مراد آبادی، نوح ناروی اور جوش ملیح آبادی شامل ہوئے تو مظفر وارثی ان کی شعر سرائی سے بہت متاثر ہوئے اور خود بھی شعر ''جوڑنے'' لگے۔ ان کے سامنے گھر میں ایک بڑی مثال ان کے والد کی تھی جو خود بھی شاعر

تھے اور اپنی خطابت سے لوگوں کو مسحور بھی کرتے تھے۔ یہ خاندان آزادی کے بعد میرٹھ سے ہجرت کر کے پاکستان آ گیا۔ ان کا پہلا قیام کراچی میں تھا۔ یہیں مظفر وارثی نے پہلی مرتبہ ایک طرحی مشاعرے میں شرکت کی۔ اپنی غزل نگاری کے اس آغاز کی بات ان کے اپنے الفاظ میں سنیے:

> ''جب پاکستان آئے تو اس دور میں طرحی مشاعروں کی روایت عام تھی۔ میں نے کراچی کے ایک طرحی مشاعرے میں شرکت کی۔ والد صاحب کی زمین میں چند اشعار لکھے ایک شعر ان کا، ایک اپنا ملا کر غزل پوری کی اور مشاعرے میں سنا دی۔ والد صاحب کے اشعار پر داد ملی، میرے اشعار محض سن لیے گئے۔ صرف مقطع پسند کیا گیا۔''

مشاعرے کی اس داد نے مظفر وارثی کا حوصلہ بڑھایا اور انہوں نے اپنے باطن سے ایک حقیقی شاعر کو دریافت کرنے کی طرف دھیان دیا تو والد صاحب نے تھپکی دی۔ مظفر وارثی نے اپنی کہی ہوئی غزل ان کے سامنے رکھ دی اور صوفی وارثی صاحب نے نہ صرف اس کی نوک پلک سنوار دی بلکہ شاعری کے رموز فن بھی سکھائے۔ نوعمر مظفر کے شعور نے ان کی انگلی پکڑ لی۔ شاعری کے ساتھ ان کی فقیری، درویشی اور قلندری کے اوصاف قبول کیے لیکن گرد و پیش میں رونما ہونے والے حالات اور واقعات کو نظر انداز نہیں کیا۔ مطالعے کا شوق بڑھا تو پہلے اپنے گھر کے ذخیرۂ کتب سے میر تقی میر، مرزا غالب، داغ دہلوی، امام بخش ناسخ، جلیل مانک پوری، حتیٰ کہ نوح ناروی تک کو پوری رغبت سے پڑھا۔ کتاب خرید نہیں سکتے تھے کہ پاکستان آنے کے بعد ان کے خاندان کو عسرت کا سامنا کرنا پڑا۔ علم کی پیاس بجھانے کے لیے مقامی لائبریریوں سے استفادہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور کے نئے شاعروں کے تجربات میں ان کی دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ انہیں اپنے وجود میں ایک مسافر سانس لیتا ہوا محسوس ہونے لگا لیکن نظر اٹھا کر دیکھا تو دنیا ایک سمندر نظر آئی جس میں مسافر ہچکولے کھا رہا تھا۔ ان ہچکولوں سے ہی روایت کے شاعر مظفر وارثی انحراف کے راستے پر چل کھڑے ہوئے اور وہ حقیقت کے باطن سے ایک اور حقیقت کی بازیافت

میں دلچسپی لینے لگے تو اپنی بات بہ انداز دگر کہنے لگے۔ ان کی غزل میں ایک نئے رنگ کی غزل پرورش پانے لگی۔ جس میں زمانے کا مشاہدہ منعکس ہوتا تو یہ مظفر وارثی کی تخلیقی انفرادیت کا مظہر بن جاتا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

○

نکھر سکا نہ بدن چاندنی میں سونے سے
سحر ہوئی تو خراشیں چنیں بچھونے سے

مرے دکھوں سے بھی کچھ فائدہ اُٹھا، دنیا
زمیں کی پیاس بجھی، بادلوں کے رونے سے

○

بیچتا ہوں تو دل و جاں نہیں لیتا کوئی
دیکھتا ہوں تو ہر اک ہاتھ خریدار لگے

تیرے دریا نے بھی پیاسوں کو نہ سیراب کیا
ڈوبنے کی جنہیں حسرت تھی، وہی پار لگے

○

شب کا سکوت، دشت کی، تنہائی دے گیا
کیا کیا وہ یادگار شناسائی دے گیا

آنکھیں ملا کے مجھ سے مظفر گیا کوئی
یا تحفۂ مرقع چغتائی دے گیا

○

زخم دل اور ہرا، خون تمنا سے ہوا
تشنگی کا مری آغاز ہی دریا سے ہوا

دور جا کر مری آواز سنی دنیا نے
فن اجاگر مرا آئینہ فردا سے ہوا

اجنبی سا نظر آیا ہوں مظفر خود کو
بے تکلف جو میں اس عہدہ شناسا سے ہوا

○

سوچ کی ذلت سہوں یا تابع دنیا رہوں
ذہنی منصوبے بنائے وقت من مانی کرے

دے کے لالچ رونقوں کے لے چلی بازار میں
دیکھیے، اب کیا تماشا، گھر کی ویرانی کرے

مظفر وارثی 20 دسمبر 1933ء کو میرٹھ (ہندوستان) میں ڈاکٹر محمد شرف الدین احمد صدیقی کے ہاں پیدا ہوئے تو ان کا نام محمد مظفر الدین رکھا گیا۔ ان کے والد شاعر تھے اور ادبی حلقوں میں صوفی وارثی کے نام سے معروف تھے۔ سیاسی اعتبار سے ان کا تعلق جمیعت

العلمائے ہند سے تھا۔ 1947ء میں ملک تقسیم ہوا تو اُن کا خاندان پاکستان میں ہجرت کر کے آ گیا اور یہیں مظفر وارثی نے میٹرک پاس کرنے کے بعد عملی زندگی کا آغاز اسٹیٹ بنک آف پاکستان کی ملازمت سے کیا۔ وہ تلمیذ الرحمٰن تھے۔ شاعری ان کا شوق تھا، پیشہ نہیں تھا۔ بینک کی ملازمت نے ان کو آسودہ زندگی گزارنے کا اور شاعری نے ذوق کی تسکین کا موقع فراوانی سے فراہم کیا۔ چنانچہ انہوں نے اردو کی مقبول اصناف میں شاعری کی، وہ مشاعروں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے اور غزل ترنم سے پڑھتے تھے۔ مشاعروں کی مقبولیت ہی انہیں فلمی دنیا میں کھینچ لے گئی لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ فلموں کی گیت نگاری میں انہوں نے شاعری کے فنی تقاضوں کی پوری پاس داری کی اور ان کا نام قتیل شفائی، سیف الدین سیف، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، راجہ مہدی علی خان اور تنویر نقوی کے ساتھ لیا جانے لگا۔ ان کے گیت کسی فلم کی کامیابی کے ضامن سمجھے جانے لگے۔ مثال کے طور پر لقمان کی فلم ''فرشتہ'' میں مظفر وارثی کے گیت ''دل کی دھڑکن تیری آواز ہوئی جاتی ہے۔'' کو رشید عطرے نے موسیقی کی ایک دلنواز دھن میں پیش کیا تو یہ گیت ہٹ ہو گیا اور اب تک کانوں میں رس گھولتا ہے۔ مظفر وارثی کہا کرتے تھے کہ مسعود رانا نے جب ان کا گیت ''کیا کہوں اے دنیا والو، کیا ہوں میں'' اپنی آواز میں پیش کیا تو ان کی مقبولیت کو چار چاند لگ گئے۔ ان کا ایک اور گیت ''دکھائے دل جو کسی کا وہ آدمی کیا ہے'' اس وقت مجھے اپنی نغمگی سے یاد آ رہا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ مظفر وارثی جب حمد و نعت نگاری کی طرف آئے تو انہوں نے فلمی گیت نگاری کو یکسر ترک کر دیا اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی نعت نگاری نے ان کی غزل کو پس منظر میں دھکیل دیا۔ ان کی نعت کو قبول عام عقیدت کی فراوانی اور جذبے کی نئی بنت کاری نے دیا لیکن ان کی مقبولیت میں ان کا ترنم بھی شامل تھا۔ جس کی لے ان کی اپنی اختراع تھی اور لحن ایسا کہ جس کی تقلید نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ نعت کو اپنی عقیدت کے والہانہ اظہار کا وسیلہ سمجھتے تھے اور اس کے ابلاغ عامہ کے لیے ہمیشہ آسان الفاظ کا انتخاب کرتے۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے یہ

حقیقت بیان کرنے سے گریز نہ کیا کہ

''بعض لوگ واقعی اپنی علمیت کی دھاک بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ عبدالعزیز خالد کو لے لیں، انہوں نے نعت لکھتے وقت لغت لکھنے کی کوشش کی ہے۔ایک لفظ کے جتنے بھی ماخذ ہیں، انہیں استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔اس سے علمیت کی دھاک تو بیٹھ جاتی ہے لیکن جذبہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ میں تو قابلیت کو طاق میں رکھ کر حضورؐ کے دربار عالیہ میں حاضر ہوتا ہوں۔''

غزل کو جدید پیکر عطا کرنے والے مظفر وارثی نے اردو نعت کو بھی نئی تاب و توانائی، خیال کی رعنائی اور جذبے کی ندرت عطا کی ہے۔چند اشعار حسب ذیل ہیں:

ہر بات اک صحیفہ تھی امی رسولؐ کی
الفاظ تھے خدا کے، زباں تھی رسولؐ کی

وحدانیت کے پھول کھلے گرم ریت سے
دی سنگ بے زباں نے گواہی رسول کی

کھلتے ہیں در کچھ اور مظفر شعور کے
کرتا ہوں جب میں بات خدا کے رسول کی

○

مانگے تھے میں نے آپ سے رحمت کے چند پھول
سارا چمن دعاؤں کی ڈالی پہ رکھ دیا

لکھنے چلا جو نعت تو میرے حضورؐ نے
لفظوں کا ڈھیر ذہن کی تھالی پہ رکھ دیا

○

تجھ کو آنکھوں میں لیے جب میں یہ دنیا دیکھوں
ہر سحر میں تیرے ماتھے کا اجالا دیکھوں

میری بینائیوں کے پر سے نکل آئے ہیں
جب خلاؤں میں ترا نقش کف پا دیکھوں

تری انگشت تصور سے بھی چشمے پھوٹیں
تیرے صحرا میں کسی کو بھی نہ پیاسا دیکھوں

مظفر وارثی کے نعتیہ مجموعوں میں ''بابِ حرم''۔۔۔''نور ازل''،''کعبہء عشق''،''دل سے درِ نبیؐ تک''،''میرے اچھے رسولؐ''،''صاحب التاجؐ'' اور ''امی لقبی'' بہت معروف ہیں۔

حمد وثناء کے حوالے سے ان کے دو مجموعے ’الحمد‘ اور لاشریک‘‘ کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے مظفر وارثی کی موجودگی میں کہا تھا کہ انکا مجموعہ حمدیہ شاعری کا پہلا مجموعہ ہے۔ سید صاحب کی تحقیق کی تردید کسی حمد نگار نے نہیں کی۔ اور مضطر خیر آبادی نے اپنا حمدیہ کلام یکجا کیا تو اسے ’’پمفلٹ‘‘ موسوم کیا گیا۔

مظفر وارثی اپنی زندگی میں عوامی پذیرائی اور شہرت عامہ سے کبھی محروم نہیں ہوئے تاہم انہیں یہ احساس بھی تھا کہ ان کے معاصرین نے نعت خوان کہہ کر ان کی قدر و قیمت کم کرنے کی کوشش کی تھی، اور ان کی نعت نگاری کے ساتھ انکی غزل نگاری کی تحسین سے بھی گریز کیا گیا۔ حسن رضوی کو انٹرویو دیا تو مظفر وارثی نے خاصے تلخ انداز میں کہا:

> ’’نعت خوان‘‘ میرے ان خیر خواہوں کا دیا ہوا لقب ہے جو مجھے غزل کا شاعر تسلیم نہیں کرتے تاکہ میری غزل پس منظر میں چلی جائے۔ جب میں نعت کہتا تھا تب انہیں میری غزل سے وہی تکلیف پہنچتی تھی جو اب میری نعت سے ہوتی ہے۔ (حالانکہ) میں پہلے کی طرح ہی غزل بھی لکھتا ہوں۔‘‘

مظفر وارثی اس قسم کے تاثر کو گوش ہوش سے سنتے تھے اور نقاد کی جانبداری کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے عصری تنقید کو مسترد کیا تو کہا:

> ’’..... میں کسی کو نقاد تسلیم نہیں کرتا، کیوں کہ ابھی تک ہمارے ملک میں ایسا کوئی نقاد پیدا نہیں ہوا جو بالکل غیر جانبدار ہو کے پورے ادب پر تبصرہ کرے۔ ہمارے ہاں روایت یہ ہے کہ جو نقاد ادب پر تبصرہ کرتا ہے وہ پہلے سے ہی الگ الگ نام چن لیتا ہے کہ کس کو نوازنا ہے اور کسے رگیدنا ہے۔ حالانکہ کسی بھی تعصب کے بغیر ادب پر تبصرہ کیا جانا چاہیے۔‘‘

اور یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ مظفر وارثی نے اپنے عہد کے نقاد سے بے نیاز ہو کر اپنی

غزلیات کا پہلا مجموعہ 1972ء میں ''برف کی ناؤ'' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ نظموں اور گیتوں کے حوالے سے ان کے مجموعے ''حصار''...... ''ظلم نہ سہنا''....... ''لہو کی ہریالی''..... ''پربت'' اور ''کمند'' چھپ چکے ہیں۔ ''گئے دنوں کا سراغ'' ان کی خودنوشت سوانح عمری کا عنوان ہے جس میں مظفر وارثی اپنی ''انا'' کا تحفظ خود کرتے ہیں اور اپنے معاصرین کی سطحیت کو جرأت مندی سے نشان زد کردیتے ہیں۔

مظفر وارثی کی زندگی کا یہ واقعہ بھی اہم ہے کہ اسٹیٹ بینک کی ملازمت سے فارغ ہوئے تو ''انقلاب اسلام'' کا نظریہ لے کر وہ طاہر القادری کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ وہ میدان عمل میں ایک سپاہی کی طرح اترے تھے لیکن جب طاہر القادری کی جماعت کا طرزِ عمل اپنی آنکھوں سے دیکھا تو مایوس ہو گئے اور واپس یہ تاثر لے کر آ گئے کہ:

''ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ''

مظفر وارثی کی ادبی زندگی کا یہ واقعہ بھی اہم ہے کہ طاہر القادری کی جماعت کو خیر باد کہنے کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کی آخری علالت تک نظریاتی روزنامہ ''نوائے وقت'' میں سیاسی قطعات لکھے جو ادارتی صفحے پر نمایاں طور پر چھپتے تھے۔ مظفر وارثی صبح کا اخبار پڑھنے کے بعد سیاسی، سماجی اور تہذیبی زاویے کی کسی خبر کا انتخاب کرتے، ذہن میں ردِعمل مرتب کرتے اور قطعہ ٹیلی فون پر املا کروا دیتے۔ ''نوائے وقت'' سے وابستگی کے دوران اکثر یہ قطعہ ان سے میں وصول کرتا اور مشینی کتابت کے بعد انہیں فون پر ہی سنا دیتا تھا۔ گزشتہ دنوں ان کا قطعہ اچانک چھپنا بند ہو جانے پر میں فکر مند ہو گیا تو معلوم ہوا کہ مظفر وارثی علیل ہیں اور پھر یہ علالت ہی ان کے لیے کوچِ ندا کا بلاوا بن گئی اور یہ قادر الکلام شاعر جو نعت کو اپنی دنیا اور عاقبت شمار کرتا تھا، عقبیٰ کو روانہ ہو گیا تھا۔ حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا۔
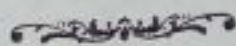
ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کو اس دنیا سے رخصت ہوئے کچھ عرصہ ہوا ہے، لیکن ان سے استفادہ کرنے اور ان کے قاموسی علم سے فیض اٹھانے والے ان کے سانحہ ارتحال پر اب تک غم زدہ ہیں، ممتاز نقاد شمس الرحمان فاروقی نے ان کا تعزیت نامہ ''اردو ادب'' دہلی میں لکھا تو اعتراف کیا کہ:

> ''نثار احمد فاروقی کے حاضر علم، عمدہ حافظے اور اپنے علم سے دوسروں کو مستفید ہونے کا بے دریغ موقع دینے کی جبلت نے انہیں ایک عالم کا رجوعہ بنا دیا تھا۔ میں نے ان کے انتقال کی خبر سنی تو بے ساختہ حالی کے مرثیہ غالب کے شعر یاد آئے:
>
> لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں اہل میت جنازہ ٹھہرائیں
> لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں''

نثار احمد فاروقی کا شمار ان محققوں اور نقادوں میں ہوتا تھا جنھوں نے مخطوطہ خوانی اور مخطوطہ شناسی میں ہی نہیں، اردو، عربی، فارسی، انگریزی اور ہندی ادب کو قدامت کے اندھیروں سے نکالا اور انہیں اپنے علم کی تجلی سے روشن کردیا۔ اردو میں تحقیق کی طرف بہت کم لوگ آتے ہیں، اس زبان میں حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالستار، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر نجم الاسلام، رشید حسن خان، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان اور مشفق خواجہ جیسے اعلیٰ معیار کے محقق بہت کم ہیں۔ حالیہ دور میں نثار احمد فاروقی کا دم غنیمت تھا جنھوں نے دوسروں کے علمی و ادبی اثاثے کو صحت نظر سے دیکھنے کی کاوش کی اور نایاب اور کمیاب کتابوں کو نہ صرف کونے کھدوروں سے ڈھونڈ نکالا بلکہ ان کے متن میں شامل ہوجانے والی ارادۃً یا سہواً اغلاط کی شمولیت کا سراغ بھی لگایا۔ اور حقائق کی پیشکش میں

کسی رو رعایت سے کام نہ لیا۔

مثال کے طور پر" ایک فارسی مخطوطے میں درج تھا کہ ایک غیر مسلم نے کسی بزرگ کی خدمت میں حاضری دی اور سلام کیا تو ان بزرگ نے فرمایا" ہلاک شو"۔۔۔اس پر اعتراض ہوا کہ یہ شان بزرگی کے خلاف تھا کہ کسی کو سلام کے جواب میں بددعا دی جائے۔ نثار احمد فاروقی نے تصحیح کی کہ یہ فقرہ "ہداک اللہ" (اللہ تجھ کو ہدایت دے) ہوگا، جسے کاتب کے تصرف نے "ہلاک شو" بنا دیا۔ یہ تصحیح قیاس ہے، لیکن اس کی صحت سے انکار ممکن نہیں۔ ہندوستان کے مشہور علمی شہر اعظم گڑھ کے قریب ہی ایک قصبہ عظمت گڑھ موجود ہے جس کی وجہ تسمیہ کسی کو معلوم نہیں تھی۔ نثار احمد فاروقی نے تحقیق سے بتایا کہ" اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں دو امراء اعظم خان اور عظمت خان آپس میں بھائی بھائی تھے۔ اورنگ زیب نے انہیں علاقہ پورب میں بعض سرکشوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا تھا۔ وہ اپنے فرض معینہ میں کامیاب ہوئے تو اورنگ زیب نے انہیں وہیں پر جاگیر وطنی بخش دی۔ ایک بھائی نے اعظم گڑھ بسایا اور دوسرے نے عظمت گڑھ"۔۔۔ یہ تحقیق بھی نثار احمد فاروقی کی ہے کہ بادشاہوں کے زمانے میں جو ہاتھی مجرموں کو پاؤں تلے روند کر موت کے گھاٹ اتارتے تھے، وہ عام ہاتھی نہیں ہوتے تھے بلکہ انہیں پاؤں تلے روند کر مارنے کی باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔ غیر تربیت یافتہ ہاتھی یہ کام انجام نہیں دے سکتا تھا۔" اودھ پنچ" میں" مولانا دکنی"۔۔۔" مس سہروردیہ" اور" لافر" کے فرضی ناموں سے لکھنے والے کے نام کا انکشاف بھی انہوں نے ہی کیا کہ یہ صاحب/ صاحبہ درحقیقت فضل ستار نقوی تھے جو عبدالغفور شہباز کے شاگرد تھے۔ میرزا رفیع سودا کے بارے میں ان کی موت کا سبب معدوم ہو گیا تھا۔ انہوں نے ایک قطعہ تاریخ ڈھونڈ نکالا جس سے یہ صراحت ہوتی تھی کہ مرزا سودا کی موت بہت زیادہ آم کھا جانے سے ہوئی تھی، اس نوع کی بہت سی دریافتوں کا سہرا نثار احمد فاروقی کے سر باندھا جا چکا ہے۔

نثار احمد فاروقی کا سلسلہء نسب 41 واسطوں سے حضرت عمر بن الخطابؓ تک اور 22

واسطوں سے بابا فرید مسعود شکر گنج تک پہنچتا ہے۔ ان کے دادا مولوی حسین احمد فریدی (متوفی 1914) کی تعلیم لاہور، بہاول پور اور ملتان میں ہوئی اور پھر انہوں نے امروہہ میں اپنے خاندان کی زمینداری کا کام سنبھال لیا۔ ان کے والد تسلیم احمد فریدی (متوفی 1987ء) نے جائیدا کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا تو زمین کے مسائل اور مقدموں میں الجھ گئے، جاٹوں کی ایک جماعت نے ان پر حملہ کر دیا۔ جان تو بچ گئی لیکن اس واقعے نے انہیں فاتر العقل کر دیا۔ اس حالت میں وہ 45 برس تک زندہ رہے جب یہ حادثہ پیش آیا تو نثار احمد فاروقی کی عمر آٹھ برس تھی (پیدائش 29 جون 1934ء) ان کی تربیت ان کے نانا شاہ سلیمان احمد چشتی نے کی اور محبت اور استقلال سے بہت کچھ گھر پر ہی پڑھا دیا۔ 1952ء میں بھارت کی حکومت نے زمینداری ختم کر دی اور ان کی جائیداد ٹھیکیدار نے ہڑپ کر لی تو وہ تلاش معاش میں کوشاں ہوگئے اور فلمی رسالہ ''شمع'' دہلی میں ملازمت اختیار کی۔ یوسف دہلوی نے ''آئینہ'' جاری کیا تو اس کے شعبہء ادارت میں نثار احمد فاروقی کو جن کے ایک چچا ممتاز دانشور برہان احمد فاروقی لاہور میں رہتے تھے، شامل کر لیا۔ یہاں ان کا واسطہ مشہور ترقی پسند ادیب ظ۔انصاری سے پڑا۔ فاروقی صاحب نے لکھا ہے:

''اسی زمانے میں ظ۔ انصاری کو بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا، اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے سے منافقانہ تعلقات رکھتے تھے'' ہفتہ وار ''آئینہ'' سے قطع تعلق کے بعد انہوں نے دہلی یونیورسٹی لائبریری میں ایک کلرک کی حیثیت میں ملازمت اختیار کر لی۔ اور اس دوران لائبریرین بنگالی داس گپتا کی عنایت سے اردو، فارسی اور عربی کی بے شمار کتابیں بالا استعاب پڑھ ڈالیں۔ اس ملازمت کے دوران ہی انہوں نے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیے۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور دہلی یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ 1962ء میں ملازمت کی کشتی جلا دی اور ایم اے عربی میں داخلہ لے لیا، 1964ء میں اول حیثیت حاصل کرنے کے بعد انہیں دہلی یونیورسٹی میں ہی عربی میں لیکچرار کی پوسٹ مل گئی۔ 1986ء میں انہیں پروفیسر بنا دیا گیا۔ 1989ء میں ریٹائر ہوئے تو نثار احمد فاروقی اس یونیورسٹی میں صدر شعبہ

کی خدمات تین سال تک انجام دے چکے تھے، یہ ایک محنت کش خود ساختہ انسان کی زندگی کا اجمال ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ اس عرصے میں انہوں نے ادب میں بھی اپنا مقام بنالیا تھا۔ شاعری امروہہ میں شروع کی جہاں ان کے استاد ایک شاعر کوثر القادری تھے جنہیں رئیس امروہوی سے تلمذ حاصل تھا۔ ان کی پہلی کہانی انگریزی سے ترجمہ شدہ تھی جو رسالہ ''آجکل'' دہلی میں 1951ء میں چھپی۔ اس کا معاوضہ انہیں 30 روپے ملا جو اس زمانے میں ایک بڑی رقم تھی، ان کی پہلی قابل ذکر کتاب ''ذکر میر'' کا اردو ترجمہ ہے جو ''میر کی آپ بیتی'' کے عنوان سے 1957ء میں شائع ہوا۔ اس دوران وہ امرتسر کے رسالہ ''پگڈنڈی'' کی ادارت کرتے رہے جس کا اداریہ گوپی چند نارنگ ہنگامہ خیز انداز میں لکھتے تھے، دہلی کالج میں ایم اے کے زمانے میں انہوں نے ''دہلی کالج میگزین'' کا ضخیم میر نمبر'' 1963 میں شائع کیا۔ اس کے بہت سے مضامین بعد میں محمد طفیل نے رسالہ نقوش لاہور کے ''میر نمبر'' میں شائع کیے، 1964ء میں ان کے مضامین کا مجموعہ ''دید و دریافت'' آزاد کتاب گھر دہلی سے قاضی معزالدین احمد نے شائع کیا۔ اس کے بعد تو ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین اس تسلسل تواتر سے سامنے آنے لگے کہ ان کا شمار ممکن نہ رہا۔ 1994ء میں رسالہ ''کتاب نما'' دہلی کا ان کے بارے میں ڈاکٹر خلیق انجم نے ایک خصوصی شمارہ پیش کیا تو اس کیلئے محترمہ سلمیٰ صدیقی (اہلیہ ڈاکٹر سعادت علی صدیقی) نے ان کے مضامین اور کتابوں کا جو اشاریہ ان کی ڈائریوں سے مرتب کیا، وہ چودہ صفحات میں سما سکا۔ اور اس کے بعد انہوں نے مزید جو کچھ لکھا وہ بھی اتنے ہی صفحات پر محیط ہے۔ صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے ان کی ادبی کاوشوں پر 1985ء میں قومی ایوارڈ عطا کیا۔ تنقید وتحقیق کے لیے انہیں ''دلی اردو اکیڈمی ایوارڈ'' اور ''افتخار میر'' ایوارڈ دیئے گئے۔ ''سراج اورنگ آبادی'' کے مقالے پر انہیں پاکستان کا نقوش ایوارڈ پیش کیا گیا۔ ان کی مطبوعہ تخلیقات میں سے چند کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:

''میر کی آپ بیتی''۔۔۔''دید و دریافت'' (مضامین)۔ ''غالب کی آپ

بچی''۔۔۔۔''تلاش غالب''۔۔۔۔''تلاش میر''۔۔۔۔''دراسات''
(مضامین)،''چشتی تعلیمات اور عصر حاضر میں ان کی اہمیت''۔۔۔۔
''عالم بشریت کے لیے سیرت طیبہ کی اہمیت''۔۔۔۔''عربوں کی تاریخ
نویسی''۔۔۔۔''طبقات الشعرا''(تدوین)۔''کلیات مصحفی''(تدوین)
۔۔۔۔''مقالات الشعراء(قیام الدین حیرت''۔۔۔۔۔''تذکرہ
حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء''۔۔۔۔''مرقومات امدادیہ''۔۔۔۔۔
''تاریخ طبری کے ماخذ کا تحلیقی اور تنقیدی مطالعہ''۔۔۔۔۔''یادگاری
خطبات''۔۔۔۔۔''شاہ ولی اللہ دہلوی کے مکتوبات''

نثار احمد فاروقی کے اردو مطالعات میں میر تقی میر، اسد اللہ خان غالب، غلام ہمدانی مصحفی، ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کو خصوصی اہمت حاصل تھی۔یہ بات پہلی بار نثار احمد فاروقی نے بتائی کہ میر نے''ذکر میر''لکھی تو سراج الدین علی خان آرزو کی کتاب''چراغ ہدایت''ان کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔غالب کے دیوان کا نسخہء امروہہ انہوں نے توفیق احمد قداری (بھوپال) سے دریافت کیا اور اسے''نقوش''لاہور کے''بیاض غالب نمبر''میں شائع کرایا۔نثار احمد فاروقی کے ذاتی کردار کا ذکر شمس الرحمٰن فاروقی نے کیا تو ان کی اس خوبی کا اعتراف کیا کہ اپنے ذہن اور اپنی کتابوں کے معاملے میں وہ بہت فراخ دل اور فیاض تھے اور اپنے کتب خانے کے خزانے تشنگان ادب کو بے دھڑک دے ڈالتے تھے۔شمس الرحمان فاروقی رقم رطراز ہیں:

> ''انہوں (نثار احمد فاروقی) نے اپنے کسی مضمون میں غالب کے شارحین کے ضمن میں ایک بہت کم معروف کتاب کا ذکر کیا تھا جس کے مصنف ان کے خیال میں درگاہ پرشاد نادر دہلوی تھے۔مجھے اتفاقاً اس کتاب کی ضرورت پڑی تو میں نے انہیں لکھ کر ممکن ہو تو اس کی نقل میرے خرچ پر بنوالیں اور مجھے بھیج دیں، میں ان دنوں پٹنہ تھا۔میری حیرت کی انتہا نہ ہی

جب اگلی ڈاک سے مجھے ایک پیکٹ ملا جس میں اصل کتاب تھی اور نثار صاحب کا خط تھا کہ جب تک چاہیں کتاب کو اپنے پاس رکھیں۔"

نثار احمد فاروقی کی فیاضی اور ادبی معاملات کے تعاون کے اس تذکرے میں انہیں مسعود حسین رضوی (مرحوم) یاد آ گئے تو ان کا ذکر کیے بغیر بھی نہ رہ سکے۔

شمس الرحمان فاروقی نے لکھا:

"(مسعود حسن رضوی ادیب) اپنی کتاب عاریتاً دینے میں بھی میری ہی طرح محتاط تھے، ایک بار جب ایک صاحب نے ان سے ایک کتاب مانگی اور کہا کہ میں اپنی جان سے بڑھ کر اس کی حفاظت کروں گا تو مسعود حسن رضوی ادیب نے یہ جواب دے کر ان صاحب سے اپنے تعلقات زندگی بھر کے لیے خراب کر لیے کہ "صاحب، درست آپ میری کتاب کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ کریں گے لیکن آپ کی جان ہی کا کیا اعتبار ہے؟"

اس مرحلے پر شمس الرحمان فاروقی نے نثار صاحب کی توصیف کی تو لکھا "یہاں نثار صاحب ہیں کہ نادر اور بے حد کم معروف کتابوں کو اس بے تکلفی سے مجھے بھیج رہے ہیں گویا کل کا اخبار بھیج رہے ہوں۔"

نثار احمد فاروقی سے مجھے ایک مرتبہ لاہور میں جاوید طفیل صاحب نے دفتر "نقوش" میں ملاقات کا اعزاز عطا کیا، دوسری مرتبہ ان سے دہلی میں غالب سیمینار میں ملنے کا اتفاق ہوا تو انہیں دفتر "نقوش" لاہور کی ملاقات یاد تھی، اسی رات انہوں نے سیمینار کے چند مندوبین کو بستی نظام الدین کے ایک ہوٹل میں مدعو کر لیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ انہیں سلیقہ گوئی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا اور وہ نہ صرف خوش مذاق انسان تھے بلکہ قہقہہ بھی کھل کر لگاتے تھے۔ دوسری طرف دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے اپنے بیان کردہ لطیفے میں رمز اپنا رنگ جماتی اور اس کی عالمانہ تہہ داری نئی معنویت بیدار کرتی، ان کی ذات سے منسوب ایک لطیفہ حسبِ ذیل ہے:

○

''حضرت بسمل سعیدی ٹونکی مرحوم کے ایک شاگرد اپنی کہی ہوئی رباعی اصلاح کے لیے پیش کر رہے تھے جس کی کی ردیف ''ہم لوگ'' تھی۔ انہوں نے دو ایک بار لفظ ''عنادل'' کو دال کے زبر سے ''عنادَل'' پڑھا، نثار احمد فاروقی حاضر الوقت تھے، انہوں نے فی البدیہہ رباعیاں کہہ کر پیش کیں کہ بسمل صاحب ان کی اصلاح بھی فرما دیجئے:

بُلبُل کو پکارتے ہیں بَلبَل ہم لوگ
کہتے ہیں عنادَل کو عنادل ہم لوگ
ہیں حضرت بسمل کے تلامیذ رشید
اللہ! کہ ہیں تابع مہمل ہم لوگ

○

میدان سخن کے ہیں کھلاڑی ہم لوگ
دیکھیں نہ اگاڑی نہ پچھاڑی ہم لوگ
ہر فن میں ہوئے طاق بہ فیض بسمل
اک شعر میں رہ گئے اناڑی ہم لوگ

نثار احمد فاروقی نے اپنی فطرت کا تجزیہ کیا تو لکھا:

''میں فطری طور پر نازک مزاج ہوں۔ باہر سے کسی کو ٹھور نظر آتا ہوں، اندر کا وہ حال ہے جو ٹکر کھانے کے بعد موٹر کی ونڈ سکرین کا ہو جاتا ہے۔ 1947ء کے بعد اپنے چھوٹے سے قصبے میں اس وقت کے مسلمان گھرانوں کی جو حالت میں نے دیکھی تھی، اس کی تلخی رگ و ریشے میں بس گئی ہے۔ میں انسان دوست ہوں، کسی کی تکلیف مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ اگر کسی کی مدد نہیں کر سکتا تو یہ کرب اور بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے...... ہمارے معاصرین میں بہت سے لوگ ڈھکوسلوں پر زندہ ہیں، حقیقت سے آنکھیں چراتے ہیں۔ علمی و ادبی استعداد کی بجائے علاقائی، مذہبی، یا لسانی نسبت سے فائدہ اٹھا کر چودھری بن گئے ہیں۔''

نثار احمد فاروقی نے بقول خود اس دنیا کو جتنا اور جیسا اور جہاں تک دیکھا تھا، اس سے

انہوں نے یہ نتیجہ نکالا:

''انسان دوستی، دردمندی، حسن اخلاق، بے عملی، پاکیزگی فکر اور اطمینان قلب صرف ایک سچے صوفی درویش کے پاس ہوتا ہے۔ باقی لوگ اس سے محروم ہیں، اسی لیے خوار ہوتے ہیں۔''

لگی لپٹی بات نہ کہنے والا نقاد، صاف اور دوٹوک انداز میں لکھنے والا یہ محقق 28 نومبر 2004ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا، اس وقت ان کی عمر 68 برس سے تجاوز کر چکی تھی، ان کا تحقیقی، تدوینی، تنقیدی اور تالیفی کام اپنی عمر کے بہت سے ادیبوں سے زیادہ تھا۔
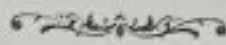
امن انقلاب بذریعہ کتاب

Peace revolution

اُردو ادب
کے
خوابیدہ ستارے

(25 نامور ادیبوں کے بارے میں ایک معلوماتی دستاویز)

○

ڈاکٹر انور سدید نے تنقید کے علاوہ افسانہ، شاعری، انشائیہ نگاری، ادارت، تبصرہ نگاری، خاکہ نگاری، شخصیت نگاری اور صحافت کے شعبے میں بھی قابل قدر کام کیا ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے وہ سارے مضامین یکجا کر کے پیش کیے ہیں جو انہوں نے فیض احمد فیض، ڈاکٹر رشید حسن خان، شفیع عقیل، انجم رومانی، اے حمید، حفیظ تائب، مظفر وارثی، عبدالعزیز خالد، احمد عقیل روبی، صابر لودھی اور ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان سمیت دیگر ادیبوں کی وفات پر تحریر کیے تھے۔

ان مضامین کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان میں ڈاکٹر انور سدید نے ہر شخصیت کی زندگی کے احوال و واقعات اور ادبی خدمات کو یوں جامع انداز سے پیش کیا ہے کہ کوئی اہم پہلو تشنۂ بیان نہیں رہا۔

Price: Rs.130/-